اقبال ریویو

اقبال اکیڈمی حیدرآباد کا رسالہ

نذرِ سید خلیل اللہ حسینیؒ

ڈمی

یدرآباد، آندھراپردیش (انڈیا)

اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا رسالہ

اشاعت اپریل سنہ ۱۹۹۳ء

مجلسِ مشاورت

- پروفیسر سعید اختر درّانی
شعبۂ طبیعیات برمنگھم یونیورسٹی

- پروفیسر رفیع الدین ہاشمی
شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

- جناب محمد طارق غازی
مینجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ، جدّہ

- ڈاکٹر معین الدین عقیل
شعبۂ اُردو، جامعہ کراچی

- پروفیسر سید سراج الدین
صدر اقبال اکیڈیمی

مجلس ادارت

جناب مصلح الدین سعدی

جناب ذکریا شریف

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

جناب وجیہہ الدین احمد

محمد ظہیر الدین احمد
(معتمد مجلسِ ادارت)

بدل اشتراک

ہندوستان

فی شمارہ ۳۰ روپے　　دو شماروں کے لیے ۵۰ روپے

بیرونی ممالک

فی شمارہ ۴ ڈالر یا اس کے مساوی رقم

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ :

"اقبال ریویو" دفتر اقبال اکیڈیمی ، مدینہ منشن

نارائن گوڑہ ۔ حیدرآباد ۔ آندھرا پردیش (انڈیا)

پن کوڈ : 500029

فون نمبر 45230

پرنٹر پبلشر کریم رضا معتمد اقبال اکیڈیمی نے اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد میں چھپوا کر
دفتر اقبال اکیڈیمی نارائن گوڑہ، حیدرآباد (آندھرا پردیش) سے شایع کیا۔

فہرست مضامین

اداریہ	جناب مصلح الدین سعدی	۴
جناب سید خلیل اللہ حسینی، ایک تاثر	جناب عبدالرحیم قریشی	۷
روئداد جلسۂ تعزیت	جناب کریم رضا	۱۲
انتھک کام کرنے والے مصلح	مولانا ابوالحسن علی ندوی	۱۷
حمیت اور جرأت کا پیکر	مولانا منت اللہ رحمانی	۱۹
اگر خواہی حیات اندر خطر زی	جناب سید خلیل اللہ حسینی	۲۲
اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش	〃	۳۲
سوئے قطار می کشم	〃 ★	۳۵
علامہ اقبال اور تہذیب کا روحانی مقصود	ڈاکٹر وحید عشرت	۳۷
"ذوق و شوق" ایک مطالعہ	محمد ظہیر الدین احمد	۵۵
اقبال کے دو غیر مدوّن خط	ڈاکٹر معین الدین عقیل	۷۰
"اقبال اور "ہم"	محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر	۷۷
پروفیسر غلام دستگیر رشید	محمد ظہیر الدین احمد	۹۵
ایک صاحبِ نظر اقبال شناس		

نقوشِ راہ

اقبال اکیڈمی کی سرگرمیاں		۹۹
رپورٹ کارکردگی "جون ۱۹۹۰ء تا دسمبر ۱۹۹۲ء"		۱۰۲
ماہانہ اجتماعات کی روئیداد "جون ۱۹۹۰ء تا دسمبر ۱۹۹۰ء"		۱۰۸
پیامِ اقبال	جناب سید خلیل اللہ حسینی	۱۲۱
"بگیر ایں سرمایۂ بہار از من"	مولانا سلیمان سکندر	۱۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

اقبال ریویو کا یہ شمارہ اس وقت شایع ہو رہا ہے جب کہ اقبال اکیڈیمی حیدر آباد کے بانی اور صدر جناب سید خلیل اللہ حسینی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ان کی رحلت ہمارے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، اس مردِ قلندر کی زندگی کے کئی پہلوؤں کے بارے میں جو پیام اقبال کا عملی پیکر تھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن یہاں چند باتیں، فکرِ اقبال اور اقبال اکیڈیمی کے سلسلہ میں اُن کی مساعی کے بارے میں عرض کرنی ہیں۔

اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں قرآن مجید کے مطالعہ کے اثرات کو اساسی مقام حاصل ہے۔ اُن کی زمانی شخصیت کا یہ لازمانی پہلو اُن کی فکر اور پیام کو ایک عصری انقلابی محرک بنا دیتا ہے۔ وہ انسانی سماج، اور فرد کو عصرِ جدید کے تناظر میں اس ابدی پیام کی کسوٹی پر پرکھنے کے موقف میں آ گئے تھے۔ اقبال کی فکر کا یہی وہ پہلو ہے جو اُن کے فنی کارنامہ کو منفرد اور معتبر بناتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے سارے انسان اور سماجی ادارے اُن کی فکر کی زد میں آ جاتے ہیں۔ اقبال کی زندگی میں ہندوستان میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات ہوں کہ عالمی تغیرات اقبال نے ان مسائل کو انسانی تاریخ کے ایک طویل تسلسل کی ایک کڑی کے طور پر محسوس کیا۔ اُن کی نظر اِن تغیرات کی اصل تک پہنچی ہے اور قرآن مجید کے ابدی اور آفاقی پہلو تعلیمات کی روشنی میں ان کا تجزیہ کرتی ہے، ان پر حکم لگاتی ہے، ان مسائل کا حل پیش کرتی ہے۔ اقبال اس طرح انسان کے انفس و آفاق کے راز داں بن جاتے ہیں۔ اسے دانشوری کہیے یا کوئی اور نام دیجیے، اقبال اس طریقِ تفکر کے اپنے عصر میں واحد نمائندہ ہیں بلکہ شاید ابھی تک کوئی دوسرا دانائے راز جو اِس مقام کا حامل ہو پردۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہوا۔

اقبال کے بعد برصغیر ہند و پاک میں اور عالمی پیمانے پر کئی ایک اہم عبقری پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف اسلام کے آفاقی پیام کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اُس کو عصری تقاضوں کے مطابق نافذ کرنے کی جدوجہد بھی کی اور ان کوششوں کی اہمیت سے کسی کو انکار بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن ان میں ایک بھی شخصیت ایسی نظر نہیں آتی جس نے اقبال کی فکر اور اُن کے عصری طریقِ فکر کو من حیثیت الکل اپنایا ہو - اس کی مختلف وجوہات ہیں، اِس پر مفصل گفتگو کی ضرورت ہے۔

جناب سید خلیل اللہ حسینی تاریخ ایک اہم موڑ پر (۱۹۴۸ء - ۱۹۵۷ء) کے دوران ہندوستان میں فکرِ اقبال کے اس فیضان کی بازیافت کی۔ وہ بنیادی طور پر ایک مفکر تھے۔ انھوں نے اپنے عصر کے ہندوستان کو عالمی تناظر اور تاریخ انسانی کے اسی تسلسل میں سمجھنے کی کوشش کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ عالمِ انسانیت بشمول ہندوستان کی اسی میں نجات ہے کہ فکرِ اقبال کو من حیثیت الکل اپنایا جائے۔ اور اقبال نے قرآنی فکر پر اپنے غور و خوض کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کو آفاقی سطح پر جغرافیائی حدود سے بے نیاز ہوکر پورے انسانی فکری ورثہ کے تناظر میں آگے بڑھایا جائے ۔ جب تک اُن کی زبان چلتی رہی وہ اسی پیغام کو نشر کرتے رہے۔ سید خلیل اللہ حسینی نے اس مقصد کے حصول کے لیے اقبال اکیڈیمی کی تشکیل کی۔ اور ایک معروضی فورم تشکیل دینے میں کامیاب ہوگئے۔ اب اقبال اکیڈیمی سید خلیل اللہ حسینی صاحب کی ایک ایسی امانت ہے جو عصری مسائل میں اس پیامِ انسانیت کی نقیب بن کر اپنے کردار کو پورا کرسکتی ہے۔ اسی اعتبار سے سید خلیل اللہ حسینی کی شخصیت فکرِ اقبال اور عصرِ حاضر کے تناظر میں بہت اہم ہوجاتی ہے۔ ان کی زندگی، اور ان کی عملی جدوجہد کا اِس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ہندوستان میں اس پیام کی اہمیت کا احساس ہوگا حالات کی گرد اور ہمارے غیر تخلیقی سماج نے اس کام کی افادیت اور پذیرائی کو غیر محسوس بنا دیا ہے لیکن جوں جوں اِس فکر کے عملی گوشے سامنے آئیں گے، جناب سید خلیل اللہ حسینی کے اصل کارنامے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اس شمارہ میں موصوف کے بارے میں اُن کی چند تحریریں بطورِ یادگار پیش کی جارہی ہیں۔ اس کے علاوہ مختصر سوانحی خاکہ اور ان کی خدمات کے بارے میں چند تاثرات بھی پیش ہیں۔

اقبال ریویو کا یہ شمارہ کئی قابلِ قدر مضامین پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر وحید عشرت کا حضرت "علامہ اقبال اور تہذیب کا روحانی مقصود" اس موضوع پر ایک فاضلانہ مطالعہ پیش کرتا ہے۔ محترمہ بشیر النساء بشیر حیدرآباد کی قادر الکلام شاعرہ اور اقبال کی پرستار تھیں۔ اقبال کے پیام سے ان کی دلچسپی ان کے اس مضمون سے آشکارا ہے۔ جناب ظہیر الدین احمد صاحب کا مقالہ اقبال کی نظم "ذوق و شوق" پر فکر و فن کی نئی جہتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اقبال کے شعر و فن پر اس مطالعہ کے ذریعہ اقبال شناسی کے کچھ نئے معیار بھی سامنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کے اقبالیات میں اپنی تحقیقی کاوش کو اقبال کے دو غیر مدون خطوط کی شکل میں پیش کر کے اقبال پر تحقیقی مواد میں اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید اقبال اکیڈیمی کے سرپرست تھے، ان کی شخصیت اور علمی خدمات کے بارے میں ایک مختصر تعارفی مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔

اقبال اکیڈیمی کی ساری سرگرمیوں کو تو اقبال ریویو میں شائع کرنا ممکن نہیں ہے لیکن ان کے چند نمایاں نقوش کو شائع کیا جارہا ہے تاکہ یہ ایک جگہ ریکارڈ بھی رہے اور اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیوں کا ایک اجمالی خاکہ بھی سامنے آجائے۔

ہم اپنے قارئین سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اس شمارہ کے بارے میں اپنی رائے اور مفید مشوروں سے ہمیں مطلع فرمائیں۔

مصلح الدین سعدی

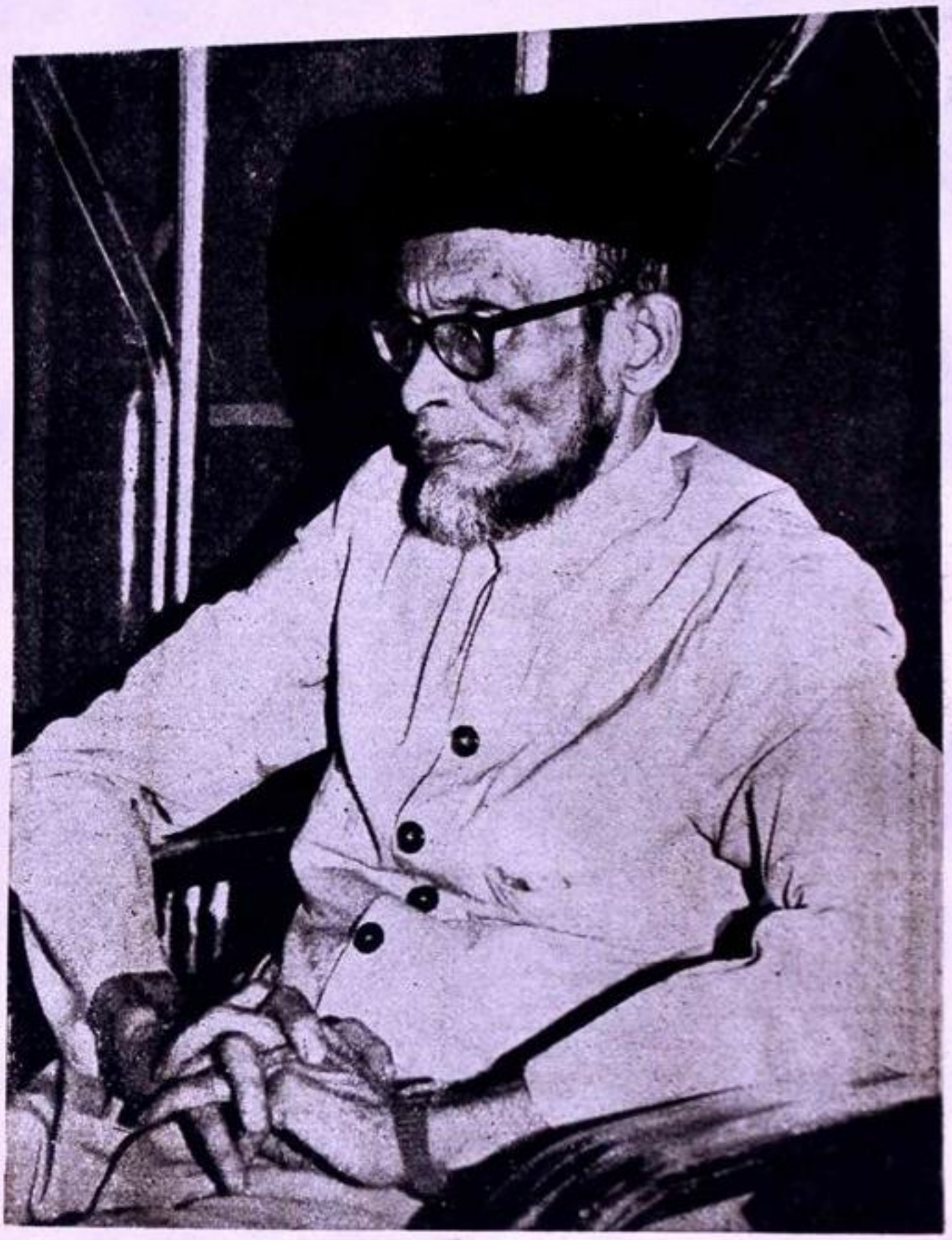

جناب سید خلیل اللہ حسینی بانی و صدر اقبال اکیڈمی

تاریخ پیدائش : ۱۸ / مارچ ۱۹۲۶ء تاریخ وفات : ۵ / دسمبر ۱۹۹۲ء

عبدالرحیم قریشی

جناب سید خلیل اللہ حسینی مرحوم
اقبال کے پیامِ حرکت و عمل کا مجسّم پیکر

مختصر سوانحی خاکہ :

جناب سید خلیل اللہ حسینی، شہر حیدرآباد میں ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے میٹرک کا امتحان درجۂ اول میں کامیاب کیا اور ساری ریاست میں دوسرے نمبر پر رہے۔ ۱۹۴۶ء میں شعبۂ فنون میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور تاریخ کے مضمون میں امتیاز پایا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں سماجیات کے مضمون سے درجۂ اول میں ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کے مواقع کو نظر انداز کر کے انھوں نے پیشۂ تدریس اختیار کیا اور ۱۹۵۰ء میں اعزاد ہائی اسکول سے بحیثیت ٹیچر وابستہ ہوئے اور ساتھ ساتھ ایوننگ لا کالج میں قانون کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ ۱۹۵۳ء میں انھیں انوار العلوم کالج میں لکچرار کی خدمت کا پیش کش کیا گیا۔ یہ ریاست حیدرآباد کے اعلیٰ تعلیم کے پہلے مسلم کالج کا آغاز تھا اور اس نو قایم شدہ کالج کے انتظامیہ نے جناب سید خلیل اللہ حسینی کی انتظامی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے انھیں اس پہلے مسلم کالج کا وائس پرنسپل مقرر کیا۔ اسی سال انھوں نے قانون کی تعلیم مکمل کی اور ال ال بی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں خالدہ بیگم صاحبہ سے ان کی شادی ہوئی۔ ۱۹۶۷ء میں وہ انوار العلوم ایوننگ کالج کے پرنسپل بنائے گئے اور کچھ ہی عرصہ بعد انوار العلوم ڈے کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں وہ اس خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی جاں سوزی نے انوار العلوم کالج کو بہت ترقی دی۔ انٹرمیڈیٹ

درجہ کے اس کالج کو انھوں نے ڈگری کالج بنایا جہاں فنون اور سوشیل سائنس کے علاوہ سائنس، الکٹرانکس اور کامرس کے شعبے قایم ہیں۔ اس خدمت کے دوران انھوں نے ان کالجس کے لیے لائبریری بلڈنگ کے علاوہ دیگر عمارات کا اضافہ کیا۔ طالبات کے لیے علیحدہ کالج کے وہ سرگرم محرک رہے اور ان ہی کوششوں سے طالبات کا وہ کالج قایم ہوا جو پرنسس شہکار ویمنس کالج کہلاتا ہے۔ حیدرآباد میں تعلیمی شعور کی بیداری میں ان کی خدمات نہایت نمایاں ہیں۔

وہ مسلم مسائل پر جرأت اور بے باکی سے اظہارِ خیال کرتے رہے۔ اسی پاداش میں انہوں نے کئی صعوبتیں برداشت کیں، کئی مقدمات کا سامنا کیا، کئی دفعہ آپ کی تقاریر پر بھی امتناع عاید کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں اور اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں جنگ بنگلہ دیش کے موقع پر جیل میں بند کردیا گیا۔ پھر ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے وقت وہ قید و بند کے طویل آزمائشی مرحلوں سے گزرے۔ اسی دوران ان کی صحت متاثر ہوگئی۔ وہ ایک طویل عرصہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ اس شعلہ بیان مقرر کی قوتِ گویائی میں بھی فرق آگیا تھا۔ لیکن لمحۂ آخر تک ان کا ذہن بیدار رہا۔ ان کے جذبۂ ایمانی نے ان کے عزائم کو کمزور نہیں کیا۔ اپنی علالت کے دوران اہم کتابیں لکھوائیں، مکتوباتِ قرآنی کا سلسلہ جاری رہا۔

بالآخر ۵ر ڈسمبر ۱۹۹۲ء کو وہ اس دنیائے فانی رخصت ہوگئے۔

پیام اقبال کی اشاعت کے لیے منظم مساعی

جناب سید خلیل اللہ حسینی، اقبال سے بے حد متاثر تھے اور اقبال کے پیام کی اشاعت پر انھوں نے اپنی کوششوں کو مرکوز کیا کہ یہ پیام، ملتِ خفتہ کی بیداری کا ذریعہ ہے۔ اپنی گفتگو، تحریر و تقریر میں اقبال کے اشعار کا برجستہ استعمال اور پھر اس دور میں جب کہ خلیل اللہ حسینی کا شمار فصیح اللسان اور شعلہ بیان مقررین میں ہوتا تھا۔ اقبال کے اشعار پڑھنے کا انداز بہت اثر انگیز رہا کرتا تھا۔ اس عزم اور باہمت شخص نے دکن کے مشہور قاید نواب بہادر

یار جنگ کی محفلوں میں اقبال کو سمجھا اور اُن کی محفلوں سے جن کو اس دور کے نامور ماہرینِ اقبالیات مخاطب کیا کرتے تھے، سید خلیل اللہ حسینی نے اقبال کے حرکت و حرارت بخشنے والے پیام کی وہ گرمی پائی جس نے انھیں ہمیشہ مضطرب اور مصروف عمل رکھا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبال کا نام لینا اور اقبال سے وابستگی کا اظہار کرنا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اقبال کے ساتھ تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کی ذمہ داری وابستہ کردی گئی تھی اور اقبال کا نام لینے والا ہندوستان کا غدار سمجھا جاتا تھا۔ سابق ریاست نظامِ حیدرآباد میں یہی کیفیت اس فوجی حملے کے بعد پیدا ہوئی جس نے اس ریاست کو ختم کرکے اس علاقہ کو ہندوستان کا جزو بنا دیا۔

جناب خلیل اللہ حسینی نے ایسے ماحول میں اقبال کے نام اور اقبال کے پیام کو نہ صرف پیش کیا بلکہ دوسروں کو بھی اقبال فہمی اور اقبال شناسی پر مائل کیا۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے سقوطِ حیدرآباد کے بعد نہایت نامساعد حالات میں نوجوانوں کے احساس مایوسی کو عزم اور حوصلہ میں بدلا۔ بزمِ احباب قائم کی اور اس بزمِ احباب کو دل ہارے مسلم طلباء اور نوجوانوں میں اسلام پر اعتماد بحال کرنے اور ان کو آمادہ عمل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ بزمِ احباب کی محفلوں میں اقبال کا کلام پڑھا جاتا اور اقبال کے پیام کے ذریعہ اسلام سے شیفتگی کی کیفیت پیدا کی جاتی۔ ۱۹۵۴ء میں بزمِ احباب کا نام مجلسِ تعمیرِ ملت رکھا گیا۔ تعمیرِ ملت کے جلسوں اور اس کے اسٹڈی سرکل کے اجتماعات میں اقبال کا کلام ہر پروگرام کا جزو ہوتا اور بعض محفلوں کا موضوع ہی اقبال اور اقبال کا پیام ہوتا تھا۔

۱۹۵۷ء میں جناب سید خلیل اللہ حسینی نے کُل ہند مجلسِ تعمیرِ ملت کے اسٹڈی سرکل کے تحت بڑے پیمانے پر دو روزہ یومِ اقبال اور نمائش اقبالیات کے منصوبہ کا اعلان کیا جس کے ساتھ ہی مخالفتوں کی بوچھار شروع ہوئی۔ ان مخالفتوں کے باوجود دو روزہ یومِ اقبال اور نمائشِ اقبالیات کا انتہائی اعلیٰ اور کامیاب پیمانہ پر انعقاد عمل میں آیا۔ ۱۹۵۹ء میں اقبال اکیڈیمی کا قیام ان ہی کی تحریک پر عمل میں لایا گیا تاکہ اس ادارہ کے ذریعہ فکرِ اقبال کی اشاعت

منظم انداز میں کی جائے اور ایسے نظریات کی تحقیق کی دعوت اصحابِ علم کو دی جائے جن پر فکرِ اقبال مبنی ہے۔ اقبال اکیڈیمی نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اقبال کے پیام کی اشاعت کے لیے مختلف سرگرمیوں کی منظم کیا اور سیمینار اور سمپوزیم کا انعقاد عمل میں لایا۔ پروفیسر صلاح الدین، ڈاکٹر ظہیر الدین الجامعی، ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ڈاکٹر غلام دستیگر رشید کے لکچرس کا اہتمام کیا۔ تقریباً ہر سال یوم اقبال کا انعقاد عمل میں لایا گیا اور نمائش اقبالیات کا انصرام کیا گیا۔ طلباء اور طالبات کیلئے مقابلے منعقد کیے گیے۔ اقبال اکیڈیمی کی تمام سرگرمیاں جناب سید خلیل اللہ حسینی، صدر اقبال اکیڈیمی کی مسلسل دلچسپی کا نتیجہ رہی ہیں۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں عالمی اقبال سیمینار کا انعقاد عمل میں لایا گیا جس میں بیرونِ ہند کے کئی ماہرینِ اقبالیات نے بھی حصہ لیا۔ اقبال اکیڈیمی کے علمی رسالہ "اقبال ریویو" کی اشاعت جاری ہے۔ اکیڈیمی نے اب تک (۱۵) کتابیں شائع کیں۔ اقبال اکیڈیمی کے ان تمام سرگرمیوں کے لیے قوتِ محرکہ جناب سید خلیل اللہ حسینی کی شخصیت رہی ہے۔

ایک دور تو وہ تھا کہ اقبال کا نام لینا جرم سمجھا جاتا تھا اور اب وہ دور ہے کہ اقبال کا نام لینا ایک فیشن اور اقبال پر کچھ کہنا ادب نوازی کی علامت بن گیا ہے اس کے ساتھ ہی ادب کے وہ نقیب جنھوں نے اقبال کو فاشست قرار دیا تھا اقبال کو اشتراکیت کا ہمنوا بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور وہ جو تخلیق پاکستان کے ناکردہ گناہ کے احساس میں مبتلا ہیں، اقبال کے وطن دوستانہ اشعار ہی میں اقبال کی ساری شخصیت کو گم کردیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے نقطہ نظر کی تائید میں فکرِ اقبال کے کسی جُز پر اصرار کرتے ہوئے اس کے مجموعی پیام کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی نے اقبال کو مسخ کرنے کی ان کوششوں پر تنقید کی اور اقبال کے معروضی مطالعہ پر زور دیا۔

جناب سید خلیل اللہ حسینی کا یہ کارنامہ بھی کچھ اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ ایسے دور میں جب کہ اقبال کو مصلحتوں کے لبادے میں پیش کیا جارہا ہو یا کسی غیر اسلامی فکر کو پروان چڑھانے کے لیے اقبال کا استحصال کیا جارہا ہو، انھوں نے اقبال کو اقبال کی حیثیت میں پیش کیا۔

جناب سید خلیل اللہ حسینی نے اقبال کو فرقہ پرست قرار دینے کی کوششوں کو کھلی زیادتی گردانتے ہوئے کہا کہ اسلام جیسے انسانیت نواز اور آفاقی پیام کو پیش کرنا فرقہ پرستی نہیں بلکہ انسانیت دوستی ہے ۔ آج ہندوستان کی فضاؤں میں اقبال کا نام بلند ہونے لگا ہے۔ اس کے لیے عزم پیدا کرنے اور ماحول کی ناسازگاری کو توڑنے کا سہرا جناب سید خلیل اللہ حسینی کے سر جاتا ہے جن کے غلغلہ کی بازگشت اب سارے ہندوستان میں سنائی دینے لگی ہے ۔ آزاد ہند میں اقبال کی بازیافت اور اقبال فہمی کی تاریخ خلیل اللہ حسینی کے تذکرہ کے بغیر نامکمل رہے گی ۔ عالمی اقبال ایوارڈ کمیٹی جدہ نے ۱۹۸۸ء میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اقبال ایوارڈ پیش کیا ۔

جناب سید خلیل اللہ حسینی کے نمایاں ملّی خدمات کے علاوہ ان کی قایم کردہ اقبال اکیڈیمی آج ایک فعّال ادارہ کی صورت میں سرگرم عمل ہے ۔

تصانیف :

۱۔ ہندوستان اور مسلمان ۲۔ دین اور دنیا ۳۔ ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر
۴۔ پاکستان کس نے بنایا ۵۔ ہندوستانی مسلمان ۶۔ اسلام کا روشن مستقبل
۷۔ جہاد کا اسلامی نقطۂ نظر' اس کے علاوہ موصوف کے خطبات، تقاریر اور مکتوبات کے حسب ذیل مجموعے شائع ہوئے ۔

۱۔ خطباتِ خلیل ۲۔ مضامینِ خلیل ۳۔ مکتوباتِ خلیل ۔ ۴۔ باپ کے خطوط بیٹی کے نام ۔

جناب سیّد خلیل اللہ حسینی کا جلسۂ تعزیت

(منعقدہ ۳؍جنوری ۱۹۹۳ء)

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام اقبال اکیڈیمی کے بانی و صدر جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب کے سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسہ پروفیسر سید سراج الدین صاحب کی صدارت میں بمقام مدینہ منشن، نارائن گوڑہ حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ جلسہ کی کاروائی کا آغاز قاری جناب عباس قادری صاحب کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ سید جاوید حسین اور سید باقر حسین نے کلام اقبال پیش کیا۔ اقبال کے افکار کی اشاعت میں سید خلیل اللہ حسینی کی مساعی پر جناب رحیم قریشی صاحب کا مضمون جناب کریم رضا نے پڑھ کر سنایا جس میں کہا گیا کہ جناب سید خلیل اللہ حسینی اقبال کی فکر سے متاثر تھے۔ انھوں نے دکن کے مشہور قاید نواب بہادر یار جنگ کی محفلوں میں اقبال کو سمجھا اور ان ہی محفلوں سے جن کو اس دور کے نامور ماہرینِ اقبالیات مخاطب کیا کرتے تھے، اقبال کے حرکت و حرارت بخشنے والے پیام کی وہ گرمی پائی جو انھیں ہمیشہ مضطرب اور مصروف عمل رکھے ہوئے تھی۔ انھوں نے ۱۹۵۹ء میں اقبال اکیڈیمی قایم کی جس نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اقبال کے پیام کی اشاعت کے لیے مختلف سرگرمیوں کو منظم کیا۔ انھوں نے کہا کہ سید خلیل اللہ حسینی صاحب نے ایسے دور میں جب کہ اقبال کو مصلحتوں کے لبادے میں پیش کیا جارہا تھا اور اقبال کا استحصال کیا جارہا تھا، اقبال کو اقبال کی حیثیت میں پیش کیا۔ جناب محمد ظہیر الدین صاحب نے خلیل اللہ حسینی صاحب سے وابستہ اپنی شخصی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں جب اسکول کا طالب علم تھا، اس وقت اُن سے میری ملاقات ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے جس مشفقانہ انداز میں مسلمانوں کے حالات اور اسلام کے تقاضوں پر روشنی ڈالی، میں نہ صرف ان کی فکر بلکہ ان کی حرکی شخصیت سے متاثر ہوا۔

انھوں نے کہا خلیل صاحب حمیت و جرأت کا پیکر تھے ۔ وہ سچائی کے علم بردار تھے اور سچائی ہی محبت کی آفریدہ ہوتی ہے ۔ وہ سچائی کے راستہ میں کسی مصلحت کو آڑے آنے نہیں دیتے تھے ۔ انھیں لوگوں کو جوڑنے کا فن آتا تھا اور انھوں نے نوجوانوں کی تربیت کو ہمیشہ اولیت دی ۔ حکومت نے انھیں فرقہ پرست سمجھا لیکن ان کی قائم کردہ اقبال اکیڈیمی ان کی وسیع النظری کی دلیل ہے جس میں انھوں نے تمام مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے اصحاب کو بلا لحاظِ مذہب شامل کیا تاکہ ہندوستان میں اقبال کے معروضی مطالعہ کی راہیں ہموار ہوسکیں جناب مصطفیٰ شروانی نے خلیل صاحب سے اپنی پچاس سالہ رفاقت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ مجھ سے عمر چار سال چھوٹے تھے لیکن طالب علمی کے زمانے سے انھوں نے متاثر کیا ۔ اقبالیات کے سلسلہ میں خلیل صاحب کی جرأت مندانہ خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اقبال اکیڈیمی کو مزید مستحکم کرنے پر زور دیا ۔ جناب شاہد حسین صاحب نے اپنے طالب علمی اور خلیل اللہ حسینی صاحب کی شاگردی کے دور کی اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ بظاہر سخت مزاج معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی ڈانٹ کے پیچھے ان کی بے پناہ شفقت پوشیدہ ہوا کرتی تھی ۔ ان کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی ۔ ان کی شخصیت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ اُن سے ملنے والا ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ خلیل صاحب اُس سے سب سے زیادہ قریب ہیں ۔ خدا تعالیٰ ایسی شخصیت کسی قوم کو انعام کی طور پر پیدا کرتا ہے ۔ جناب اسلم فرشوری نے جو خلیل اللہ صاحب کے شاگرد رہے ہیں کہا کہ میں ایک شریر طالب علم رہا ۔ خلیل صاحب مجھ پر غصہ بھی کرتے تھے اور پھر اس قدر چاہتے تھے کہ آج اُن کی شفقت اور مخلصانہ رہنمائی ہی میرے کام آرہی ہے ۔ مجھ میں جو بھی صلاحیت ہے وہ اُن ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے ۔ ہر اچھا اور بُرا طالب علم ان کی شفقت سے محروم نہیں رہا ۔ جناب سید عبد القدوس ایڈوکیٹ نے کہا کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لینا میرے خاندان کی معاشی بدحالی کی وجہ سے ممکن ہی نہیں تھا لیکن خلیل اللہ حسینی صاحب نے مجھے جو تعلیمی مراعات دیں اور جو مشورے دیئے ان ہی کی وجہ سے میں آج ایک ایڈوکیٹ کی حیثیت سے کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل بن سکا ۔ انھوں نے

ہر نوجوان میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا اور ہمیشہ معروف رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ معروف آدمی ہی زیادہ کام کر سکتا ہے اور بے کار آدمی ہمیشہ بے کار ہی رہتا ہے ——

جناب عابد صدیقی نے خلیل اللہ حسینی صاحب کو مفکر اسلام اور مفسر اقبال سے تعبیر کرتے ہوئے انوار العلوم میں اپنے دورِ طالب علمی میں خلیل صاحب کی شفقت کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ خلیل صاحب نے مسلم نوجوانوں کو کمیونزم کی زد سے بچا کر اُن میں اسلامی شعور پیدا کیا اور جذبۂ عمل کو بیدار کیا۔ خلیل اللہ حسینی سیاست داں نہیں تھے لیکن سیاست پہ اُن کی گہری نظر تھی۔ اُن کے سیاسی تدبر کا اندازہ اُن کی علمی انداز سے کی گئی تنقیدوں سے لگایا جا سکتا ہے —— جناب تیج نارائن جیسوال نے کہا کہ میری شخصیت کے تین پہلو نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں انوار العلوم کالج میں لکچرر رہوں، دوسرے یہ کہ اقبال اکیڈمی کا فاؤنڈر ممبر ہوں اور تیسرے یہ کہ میں ایک ہندو ہوں۔ یہ خلیل اللہ حسینی صاحب کی سرپرستی ہی کا نتیجہ ہے کہ میری ان تینوں حیثیتوں میں کبھی ٹکراؤ واقع نہیں ہوا۔ خلیل صاحب نے ہمیشہ غریبی میں نام پیدا کرنے کی تعلیم دی۔ وہ غریبوں کے سرپرست تھے۔ انھوں نے میرے ذاتی اور خاندانی معاملات میں بھی اسی طرح دلچسپی لی جیسے میں بھی اُن ہی کے خاندان کا ایک فرد ہوں —— جناب سید علی یداللہی نے خلیل اللہ حسینی کو عزم و استقامت کی ایک چٹان قرار دیتے ہوئے کہا کہ نامساعد حالات میں ملتِ اسلامیہ کی انھوں نے جو خدمت انجام دی ہے، قوم اس کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ملت کے اتحاد کے لیے انھوں نے جو کوششیں کیں وہ ایک وسیع النظر قایدہی کر سکتا ہے۔ انھوں نے قوم کی خدمت کے راستہ میں کبھی بھی اپنی ذات کو اونچا نہیں کیا —— جناب سکندر توفیق نے بزم احباب اور پھر تعمیر ملت کے قیام کو خلیل اللہ حسینی صاحب کا کارنامہ قرار دیا اور کہا کہ خلیل صاحب کے فکر و عمل میں ہمیشہ یکسانیت رہی۔ انھوں نے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کے لیے آخری لمحہ تک کوشش کی اور نوجوانوں کی کردار سازی کی طرف ہر وقت متوجہ رہے —— جسٹس سردار علی خاں نے خلیل اللہ حسینی صاحب کی سیاسی فکر اور تعلیمی بصیرت کا خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی شخصیت طویل علالت کے باعث عوام سے دور رہی، ان کا راست تعلق عوام سے باقی نہیں

رہا تھا پھر بھی وہ عوام کے قلوب پر چھائے ہوئے رہے ۔ انھوں نے کہا کہ نظروں سے دور رہ کر دلوں پر حکومت کرنے والے کا نام خلیل اللہ حسینی ہے ۔ سردار علی خاں نے خلیل اللہ حسینی کو ایک مردِ مومن سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اقبال کے بعد بہادر یار جنگ سے بے حد متاثر تھے ۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایک شاہین زادہ کی حیثیت میں پیش کر کے بہادر یار جنگ کی یاد تازہ کر دی ۔ ان کا رویہ ہمیشہ حقیقت پسندانہ اور ردِ عمل ہمیشہ دانشورانہ رہا ۔ انھوں نے مسلمانوں کو حفاظتِ خود اختیاری کا دانشمندانہ مشورہ دیا ۔ مسلمان ایک زندہ قوم کی حیثیت سے اپنے دوررس نگاہ رکھنے والے قاید کو کبھی نہیں بھلا سکیں گے ــــ جناب غلام یزدانی ایڈیٹر کیرلٹ نے کہا کہ خلیل اللہ حسینی صاحب نے اقبال اکیڈمی کا صرف قیام ہی عمل میں نہیں لایا بلکہ اقبال کی تعلیمات پر خود عمل کر کے بتایا ۔ انھوں نے کہا کہ خلیل صاحب کی تعلیمی میدان میں مساعی اور ان کی ملی خدمات کو ناقابلِ فراموش ہیں ۔ جناب ست نارائن نے کہا کہ میں انوار العلوم کالج کی ابتدا ہی سے خلیل اللہ حسینی کے ساتھ کام کرتا رہا ہوں ۔ انھیں مسلم لیڈر کہہ کر بدنام کیا جاتا رہا لیکن تعلیمی میدان میں انھوں نے کبھی بھی مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز نہیں برتا ۔ مجھے اُن کے ساتھ کام کرنے پر فخر حاصل ہے ۔ انوار العلوم ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے کالجس اور لائبریریز کے قیام کے لیے انھوں نے انتھک جدوجہد کی ۔ مالیہ کی فراہمی کے لیے ہم نے نہایت جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب ہم دس بارہ ہندو ٹیچرس نے بھی ملے پلی کی مسجد کے سامنے جمعہ کی نماز کے بعد بشانہ بشانہ کالج کے لیے چندہ وصول کیا تھا ــــ پروفیسر احمد اللہ خاں نے کہا کہ دانشمندی اور دیانت داری بہت کم ایک جگہ جمع ہوتے ہیں ۔ لیکن خلیل اللہ حسینی صاحب ایسے رہنما تھے جن میں یہ دونوں اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے ۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی ذات اور خاندان کی بھلائی نہیں چاہی ۔ یونیورسٹی کی جاذبِ نظر ملازمت سے انکار کر کے انھوں نے کم تنخواہ پر انوار العلوم کالج ترجیح دی ۔ انھوں نے دانشمندی سے حقِ خود اختیاری کو کبھی بھی تصادم کا ذریعہ نہیں بنایا ۔ بلکہ بقائے باہم کی سمت اس نظریہ کو دی ۔ قرآن اور سیرتِ طیبہ کی روشنی میں قوم کی قیادت کا صحیح

معیار انھوں نے پیش کیا ـــــ جناب نذیر الدین احمد نے کہا کہ موت انسان کا پیدائشی حق ہے ہر شخص مرنے کے لیے ہی پیدا ہوتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جاتے ہیں تو ہزاروں کو سوگوار کر جاتے ہیں۔ ایسی ہی شخصیتوں میں خلیل اللہ حسینی صاحب کا شمار ہوتا ہے۔ انھیں بھولا نہیں جاسکتا اس لیے کہ وہ اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے زندہ رہے۔ مسٹر نذیر نے کہا کہ خلیل اللہ حسینی کی قیادت نے پولس ایکشن کے بعد سراسیمگی کے دور میں مسلمانو کو سہارا دیا۔ حوصلہ دیا اور جینے کا سلیقہ سکھایا۔ ہم نے اس قاید کو کھو دیا جس نے قوم کو فہم و فراست اور دانش مندی کے ساتھ یہ بات بتائی کہ ہمارا کام لڑنا اور مرجانا نہیں بلکہ باقی رہنا اور آگے بڑھنا ہے ـــــ پروفیسر سراج الدین صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ خلیل اللہ حسینی مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن میرے دل میں ان کے لیے ہمیشہ عقیدت کا موجود رہا۔ کسی کی موت پر میری آنکھ نم نہیں ہوئی لیکن خلیل کی موت پر میں رو پڑا میں نے آج تک کسی ایسے تعزیتی جلسہ میں شرکت نہیں کی جہاں ہر بولنے والے نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہو۔ پروفیسر سراج الدین نے انوار العلوم کالج کو ایک تحریک قرار دیتے ہوئے مجلسِ تعمیرِ ملت اور اقبال اکیڈیمی کے قیام کو خلیل اللہ حسینی صاحب کے عظیم کارناموں سے تعبیر کیا۔ اس موقع پر جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب کی ایک یادگار تقریر کا ٹیپ بھی سنایا گیا ـــــ جناب کریم رضا، معتمد اقبال اکیڈیمی نے اس تعزیتی جلسہ کو جو تقریباً چار گھنٹے جاری رہا، کاروائی چلائی اور آخر میں مقررین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

○○

★

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

مولانا ابوالحسن علی ندوی

سید خلیل اللہ حسینی. انتھک کام کرنے والے مصلح

اللہ کی یہ سنت ہے اور خاص طور پر اس اُمت پر اس کا یہ احسان ہے کہ ہر کام کے لیے ایسے افراد پیدا فرماتا رہتا ہے جو اُمت کے آڑے وقت میں کام آتے اور کٹھن گھڑیوں میں قوم کا سہارا بن جاتے ہیں . اللہ تعالیٰ ان کے اندر وہ جذب دروں پیدا کر دیتا ہے جس سے اُن کی روح بے چین ہو جاتی ہے اور وہ تمام مصلحت پسندی، اپنی ذات، خاندان اور فرزند و عیال اور خود اپنی صحت سے بے نیاز ہو کر قوم کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔

سید خلیل اللہ حسینی صاحب کا نام اسی صف کے مردانِ عمل میں زندہ رہے گا، جنھوں نے سقوط حیدر آباد کے بعد مسلمانوں کے اندر اعتماد بحال کرنے میں مجاہدانہ کارنامہ انجام دیا ہے.

سید خلیل اللہ حسینی صاحب نے اس وقت سے لے کر جب تک کہ ان کے مرض نے صاحب فراش نہیں کر دیا، ایک لمحہ کے لیے سکون کا سانس نہیں لیا . انھوں نے ۱۹۵۱ء میں کتابچہ "ملت کی تعمیر" کے نام سے شائع کیا تھا جس میں اس حقیقت کو باور کرایا تھا کہ زوال اور عروج ہر قوم کو گزرنا پڑا ہے لیکن زوال کے بعد عروج اسی قوم کو ملا ہے جس نے اعلیٰ نصب العین کو سامنے رکھ کر اور منظم ہو کر یکسوئی کے ساتھ سرگرم عمل رہی ہے . سید خلیل اللہ حسینی صاحب نے دینی تعلیم کے انتظام اور فروغ کی طرف متوجہ کی اور اس کے لیے مختلف طریقوں سے جلسہ کر کے تقریر کے ذریعہ اور تحریر کے ذریعہ قوم کو ابھارا اور تعلیم کے لیے ادارے قائم کرائے . بے روزگاری کے خلاف جد و جہد کی اور مسلمانوں کو ہنر سیکھنے اور کسبِ حلال کی طرف مائل کیا . اور ہمیشہ ایمان و عمل کی دعوت دیتے رہے مسلم دشمن جارحیت کا مقابلہ ایک نہتی اور مظلوم جماعت کس طرح کر سکتی

ہے" اس کے راستے بتائے، حفاظت خود اختیاری کا مسئلہ اٹھایا اور لوگوں کو راہ عمل بتائی۔ پھر حفاظت خود اختیاری کی علمی و دینی تشریح کی اور آئین و دستور پر پابند رہتے ہوئے ایسے طریقے بتائے جس سے مسلمان حفاظت خود اختیاری پر آمادہ ہوں۔ ان کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ تعلیم و صنعت، تبلیغ و تعلیم، سیاسی بحالی غرض ہر میدان میں کام کرتے رہے۔ اور مسلسل جد و جہد نے عمر سے پہلے ان کو تھکا دیا۔ ان کے شب و روز اسی فکر میں بسر ہوئے کہ کس طرح مسلمانوں کو دعوتِ عمل دی جائے۔

میرے نزدیک سید خلیل اللہ حسینی صاحب ایک انتھک کام کرنے والے مصلح اور داعی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت سے قومی و ملی کام لیے جو بعد میں آنے والوں کے لیے رہنمائی کا کام انجام دیں گے۔

○○

ملفوظاتِ اقبال

"جو قوم ایک مشن لے کر پیدا ہوئی ہے۔ اس کی روحانی تربیت کے لیے ابتلاء کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں"۔

(اقبال کے مکتوب سے اقتباس بہ نام علامہ سلیمان ندوی۔ اقبال نامہ ص ۱۸)

"ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مسلمانانِ ہند ایک بہت بڑے ابتلاء میں گرفتار ہونے والے ہیں، جس کا سلسلہ خدا جانے کب اور کہاں ختم ہوگا مگر جہاں اس ابتلاء و آزمائش میں ایک قسم کا دکھ دکھائی دیتا ہے وہاں اس کا اچھا پہلو بھی ہے۔۔۔"

(گفتارِ اقبال ص ۳۷)

مولانا منت اللہ رحمانی (مرحوم)

حمیت اور جرأت کا پیکر

مولانائے محترم نے تقریباً ۴۱ سال جناب سید خلیل اللہ حسینی کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر فرمائے تھے جن کی تلخیص پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

یوں تو آزادی کے کچھ دنوں بعد تک بھی ہندوستان کے اندر بڑی تعداد میں ریاستیں تھیں لیکن تمام ریاستوں میں مملکت آصفیہ ریاست حیدرآباد دکن کو جو ممتاز اور اہم مقام حاصل تھا۔ اس کا تصور بھی دوسری ریاستیں نہیں کر سکتی تھیں جس قدر ارباب فضل و کمال کی پذیرائی وہاں ہوئی اور ہوتی رہی، خواہ یہ حضرات حیدرآباد کے رہنے والے ہوں یا متحدہ ہندوستان کے کسی حصہ اور گوشہ کے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ ملک کے گوشہ گوشہ سے ارباب علم و فضل وہاں کشاں کشاں پہنچتے تھے اپنے علم و دانش سے پورے ملک کو ضیا بار کرتے۔

۱۹۴۸ء میں پولس ایکشن کے بعد جب مملکت آصفیہ حیدرآباد کا مستقل وجود کو ختم کر کے اسے ہندوستان میں ضم کر لیا گیا تو عجیب بے کسی اور کس مپرسی کے حالات سے وہاں کے ہر خاص و عام کو دوچار ہونا پڑا۔ اور ایسے ایسے صبر آزما، ہمت شکن اور تلخ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جو ان کے تصور و خیال کی حدوں سے بھی پرے تھا۔ ہر شخص حیران و پریشان خلاؤں میں کچھ ڈھونڈھ رہا تھا مگر کوئی چیز نہیں مل رہی تھی۔ سوچ رہا تھا مگر بات سوچ سے آگے نہیں بڑھ پاتی تھی، وہ چوراہے پر کھڑے تھے اور انہیں راہ نہیں مل رہی تھی۔ اگر کوئی چیز ان کے سامنے تھی تو وہ صرف ان کا تلخ و تاریک مستقبل۔ حقیقت یہ ہے کہ پولس ایکشن کے بعد جو حالات وہاں پیش آئے اس کا صحیح اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جنھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ ہو۔

سید خلیل اللہ حسینی

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

(موصوف کی تصنیف "اسلام کا روشن مستقبل" میں شامل ایک مضمون کی تلخیص)

حضرت اقبال اسلام کے بہت بڑے مفکر تھے جس طرح ایک زمانہ میں مولانا رومؒ نے تجدید اور احیائے اسلام کا کام کیا تھا ان کی مثنوی کو لوگ "ہست قرآن در زبان پہلوی" کہنے لگے تھے۔ اسی طرح اس دورِ پُر فتن میں اقبال نے اسلامی تعلیمات کو اشعار کے روپ میں بڑی عمدگی سے پیش کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے کلام کو قرآن و سنت کی ایسی تشریح بنا کر پیش کیا جو عصرِ حاضر کے اصحاب کے لیے قابلِ قبول ہے۔ ان کا کلام اُردو و فارسی میں ہے انہوں نے خدا سے التجا کی کہ اگر ان کے کلام میں قرآن سے ہٹ کر کوئی بات ہو تو قیامت کے روز انھیں نبی محترمؐ کے قدموں پر سجدہ کرنے کی سعادت سے محروم کر دیا جائے۔ ویسے اقبال نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم چلنے کی تعلیم دی۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اقبال کے اشعار سُن کر ایسے محو ہوئے کہ ان کے اس پیام کو بھلا بیٹھے جو ان اشعار میں موجود تھا۔ خود اقبال نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے لوگوں نے انھیں صرف شاعر سمجھا اور ان کے پیام نظر انداز کر دیا۔ اسی لیے اقبال نے اپنے قارئین سے کہا ہے کہ

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

یہ عجیب بات ہے کہ آغوشِ مغرب میں تعلیم پانے والے اقبال کے پاس اسلام کی زیادہ صحیح

ترجمانی ملتی ہے۔ انھوں نے بالکل صحیح طور پر اندازہ لگایا کہ عام انسانوں کی پستی اور ذلت کا سبب خوف ہوتا ہے اور اسلام نے ہر انسان کو بے خوف بنایا یہ وہ نکتہ ہے جس پر پہلی دو تحریکات نے کوئی توجہ نہیں دی۔

اقبال کا نقطہ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود کلمہ طیبہ وہ انقلابی پیام ہے جس کا مقصد ایک خدا سے ڈرنے اور ساری کائنات سے بے خوف بنانا ہے۔ چنانچہ اقبال نے کہا ہے

این دو حرفِ لا الہ گفتار نیست
لا الٰہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوز اُو قہاری است
لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است

(جاوید نامہ۔ خطاب بہ جاوید سخنے بہ نژاد نو)

ترجمہ: لا الٰہ محض گفتار کے دو حرف نہیں ہیں بلکہ یہ ایک خطا نہ کرنے والی تلوار کی طرح ہیں ۔۔۔ قہاری اسی کے سوز کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے۔ لا الٰہ ایک ضرب اور کاری ضرب ہے"۔

اسی بنا پر انھوں نے کہا کہ مسلمان ہونے کا مطلب وہ اقدام شوق ہے جو جذبۂ شہادت پر ختم ہوتا ہے۔

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا (باقیات اقبال)

کلمہ طیبہ نے مسلمانوں میں جو بے خوفی پیدا کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ خود قرآن کریم نے بیسیوں مقامات پر اپنے ماننے والوں کو بے خوف اور بے جگر بننے کی تلقین کی۔ اقبال نے بھی بے خوفی اور جرأت پر بہت کچھ لکھا، مثلاً وہ کہتے ہیں:

مثلِ کلیمؑ ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگ لا تخف (بال جبریل)

اقبال نے اس نقطہ نظر کو پیش کیا ہے کہ یاس، خوف و حزن ام الخبائث ہیں اور

اس کا علاج توحید ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

مرگِ راہ سامان ز قطعِ آرزو است
زندگانی محکم از لا تقنطوا است

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر

گو خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

قوتِ ایمان حیات افزایدت
وردِ لا خوفٌ علیہم بایدت

چوں کلیمےؑ سوئے فرعونے رود
قلبِ او از لا تخف محکم شود

(رموزِ بے خودی)

ترجمہ: "آرزو کا ختم ہونا موت ہے۔ زندگی صرف لا تقنطوا سے محکم ہوتی ہے اگر تیرا خدا پر اعتماد ہے تو غم سے آزاد ہو جا اور نفع و نقصان کے خیال سے بے نیاز ہو جا۔ قوتِ ایمان حیات افزا ہوتی ہے اسی لیے لا خوف علیہم کا ورد کرتے رہنا چاہیئے۔ جس طرح موسیٰ کلیم اللہ فرعون کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو ان کا دل حرف لا تخف سے محکم تھا"۔

اقبال نے نہ صرف بے خوفی کو سراہا ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ ناموافق حالات اور پُرخطر ماحول ہمارے لیے لائقِ خیر مقدم ہے۔ ہم کو ناموافق حالات سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ ان کا استقبال کرنا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

پیامِ مشرق میں کہتے ہیں کہ

اگر خواہی حیات اندر خطر زی (اگر زندگی چاہتے تو خطرات کے درمیان زندگی بسر کرو)

یعنی زندگی چاہتے ہو تو خطرات میں رہو۔ اس عنوان کی ایک نظم میں کہتے ہیں

دما دم خویشتن را بر فساں زن
ز تیغِ پاک گوہر تیز تر زن
خطر تاب و تواں را امتحان است
عیارِ ممکنات جسم و جان است (پیامِ مشرق)

ترجمہ: تو مسلسل اپنے آپ کو خطرات کی کسوٹی پر پرکھا کر اور اسی سے اپنی زندگی کی شمشیر کی دھار تیز کر۔ خطرات اور مشکلات، برداشت و استقامت کا امتحان ہیں اور یہی تیری شخصیت کو جانچنے کا معیار ہیں۔

اپنی مشہور مثنوی "مسافر" میں کہتے ہیں۔

بندۂ حق وارثِ پیغمبراں،
اُو نہ گنجد در جہانِ دیگراں
تا جہانے دیگرے پیدا کند
ایں جہانِ کہنہ را برہم زند
زندہ مرد از غیرِ حق دارد فراغ
از خودی اندر وجودِ اُو چراغ
پائے اُو محکم بر رزم خیر و شر
ذکرِ اُو شمشیر، و فکرِ اُو سپر (خطاب بہ اقوام سرحد)

ترجمہ: بندۂ حق پیغمبروں کا وارث ہوتا ہے اور وہ دوسروں کی بسائی ہوئی دنیا میں بسیرا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کہنہ جہاں کو برہم کر کے اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ مردِ زندہ ہر غیر حق سے بے خوف رہتا ہے اور اس کے وجود میں اس کی خودی چراغ کے مانند روشن رہتی ہے۔ خیر و شر کی رزم میں اس کے پاؤں مضبوطی سے جمے رہتے ہیں۔ ذکر اس کی شمشیر اور فکر اس کی سپر ہے۔

اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایمان لانے والا شخص (مومن) ہر طرح کے خوف سے پاک ہو۔ وہ نہ صرف خطرات سے نہ گھبرائے بلکہ خطرات کا خیر مقدم کرے کہ خطرات ہی مخفی صلاحیتوں

کے لیے نشو ونما کا کام کرتے ہیں۔

اقبال نے اُس علم و فن پر تنقید کی ہے جو انسان کو سپہ گری سے دور کر دیتا ہے انھوں نے ایسے علم و فن کی کوئی اہمیت تسلیم نہیں کی جو انسان کو تیغ و سپر سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

من آن علم و فراست را با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را (زبور عجم)

ترجمہ: "میرے نزدیک اس علم و فراست کی ذرہ برابر وقعت نہیں ہے جو ایک مرد غازی کو تیغ و سپر سے بیگانہ کر دے"۔

ان امور کے علاوہ اقبال ایک چونکا دینے والی بات کہتے ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ "انگریزی اقتدار نے ہمارے پورے معاشرے کو ذہنی طور پر غلام بنا دیا تھا" حتیٰ کہ مولانا الطاف حسین حالی جیسے دردمند شاعر بھی یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ؎

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

یہ نقطۂ نظر جیسا دیس ویسا بھیس کے عنوان سے بھی ہمارے رگ و پئے میں بس گیا ہے اور پورے معاشرے کا یہ نقطۂ نظر بن گیا ہے کہ وہ سیلاب کے مقابلہ میں ریگ تہ نشین کی طرح ہموار ہو جائیں اور ایک برتن میں ڈالے ہوئے پانی کی طرح مسطح ہو رہیں۔ اقبال نے ہم آہنگی (ADJUSTMENT) کے اس نقطۂ نظر کو نہیں مانا اور تاریخ اسلام کے واقعات گواہ ہیں کہ اقبال کا نقطۂ نظر ہی درست معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا کام نہیں ہے کہ زمانے سے مطابقت پیدا کرو بلکہ زمانے کا یہ کام ہے کہ تم سے ہم آہنگ ہو۔ اگر نہیں ہوتا ہے تو تمہارا کام ہے کہ اس سے ٹکراؤ اور اس کو مجبور کرو کہ وہ تم سے مطابقت پیدا کرے۔

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

"یہ کہنا کہ تم زمانہ کے ساتھ چلو اُن کا قول ہے جو زندگی سے بے خبر ہیں۔ زمانہ تیرے موافق

نہیں رہتا تو تجھے چاہیئے کہ تو زمانہ سے ٹکرائے (اور اسے اپنے موافق بنالے")

سماجیات کی پوری کتابوں میں حالات سے مطابقت (ADJUSTMENT) کی بات کہی جاتی ہے ہم لوگ غلامی کے خوگر ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہر نا موافق ماحول میں مطابقت کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم آہنگی ہمارا بنیادی اصول ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمارا طرزِ عمل مصلحت کے تابع رہتا ہے اور ہم کشمکش و پیکار سے بچنا چاہتے ہیں۔ اقبال نے کشمکش اور تصادم کو بڑی اہمیت دی ہے اور ساری پرانی قدروں کو مسمار کر دیا ہے۔ جب انھوں نے زمانے سے ٹکرانے کی بات کہی ہے اور تصادم کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

ستیز کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
اس کش مکش پیہم زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی (بانگ درا۔ ارتقاء)

ضرب کلیم میں بالکل ابتدائی اشعار یہ ہیں:

جب تک نہ زندگی کے حقایق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ (ناظرین سے)

مروجہ خیال یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے اپنے آپ کو زمانے کے رنگ میں رنگ لیا جائے۔ اور حالات جیسے ہوں بجائے ان کا مقابلہ کرنے کے ان سے ہم آہنگی یا مطابقت پیدا کر لی جائے۔

صدیوں سے غلامی کے خوگر عوام اس نقطۂ نظر کے حامل ہو گئے ہیں کہ تصادم میں خطرہ ہے توافق میں عافیت ہے۔ مزاحمت خطرے کی گھنٹی ہے مصلحت بینی باعث مسرت ہے مسلمانوں میں یہ بات آہستہ آہستہ سرایت کر گئی اور اب وہ سونے کا ہمالہ نہیں بلکہ مٹی کا ڈھیر بن گئے ہیں۔ کسی اہل علم، اور اہلِ قلم نے سماج کے اس ناسور کی طرف نظر نہیں کی۔ یہ اقبال ہی کی بالغ نظری تھی کہ انھوں نے ایک طرف تو افرادِ ملت کے ذہن سے خوفِ غیر اللہ کو مٹانے کی کوشش کی اس طرح ان کو خطر پسند بننے کی ترغیب دی۔ اس کے علاوہ ان میں یہ جارحانہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ اپنے ماحول سے مرعوب یا متاثر نہ ہوں۔ اپنے آپ کو ماحول کے رنگ میں رنگے جانے کی فکر نہ کریں بلکہ اقبال نے یہ چونکا دینے والی بات کہی کہ مومن زمانہ کا نقاد ہوتا ہے وہ زمانہ کا اثر قبول نہیں کرتا۔ بلکہ زمانہ کو متاثر کر دیتا ہے۔ اقبال کی مشہور نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" ہے جس میں وہ یہ کہتے ہیں ؎

کھو یا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیٔ محفل نہ کر قبول (ضرب کلیم)

گویا مومن کا کام اقبال کے نقطۂ نظر سے محفل گدازی ہے۔ ماحول کا اثر قبول کرنا نہیں ایک مقام پر وہ کہتے ہیں

آذر کا پیشہ خارا تراشی
کارِ خلیلاں خارا گدازی

انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کو سراپا عبادت قرار دیا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ توحید کی گواہی دیں، مشرکانہ عقاید پر برق بن کر گریں۔ وہ کہتے ہیں ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ (ضرب کلیم)

گویا مومن توحید کی شہادت دینے کے لیے ہے اور اپنے ماحول کو جس میں خدا کی یکتائی کے آثار نہ ہوں یا کم ہوں اس کو حکم کہ وہ خود بدل دے اور مومن کے مزاج کے ہم آہنگ ہو جائے۔

اقبال یہ کہتے ہیں کہ ایسے ماحول سے ٹکراؤ اور ایسے زمانہ کو بدل دو جو تم سے آہنگ نہیں ہوتا - اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسی تصادم و پیکار میں ملت کی مخفی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔

اسمائے علی مرتضیٰ رضؓ کی شرح میں اسرارِ خودی میں کہتے ہیں کہ مردِ خود دار زمانہ سے ہم آہنگ نہیں ہوتا بلکہ وہ موجودہ کو بدل کر نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاج اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ اُو جہاں
بر کند بنیادِ موجودات را
می دہد ترکیب نو ذرّات را
گردشِ ایام را برہم زند
چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد سازگار (اسرار خودی)

"جب مرد خود دار پختہ کار بن جاتا ہے تو زمانہ اپنے آپ کو اس کے موافق بنا لیتا ہے۔ اگر زمانہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو تو مردِ حق آسمان سے بھی جنگ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ عالمِ موجود کی بنیاد ڈھا کر ذرّات کو نئی ترکیب عطا کرتا ہے۔ زمانہ کی گردش کو پلٹ دیتا ہے اور نیلے آسمان کو درہم برہم کر دیتا ہے وہ اپنی قوت سے ایک ایسی نئی دنیا پیدا کرتا ہے جو اس کے لیے سازگار بن جاتی ہے"۔

آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ مخالف اور متصادم ماحول میں انسانی جوہر کی نشو و نما ہوتی ہے۔

آزمائد صاحبِ قلبِ سلیم
زورِ خود را از مہماتِ عظیم

عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکنات قوت مردان کار
گردد از مشکل پسندی آشکار (اسرار خودی)

"جو قلب سلیم کا مالک ہوتا ہے وہ بڑی بڑی مہمات کے ذریعہ اپنے زور اور قوت کو آزماتا ہے، دشواریوں کا مقابلہ عشق کے لیے خوشی کا سامان ہے جس طرح ابراہیم خلیل اللہ ؑ نے دہکتے ہوئے شعلوں سے پھول چن کر مسرت محسوس کی، میدانِ عمل میں جواں مردوں کی قوت کے امکانات مشکل پسندی ہی سے ظاہر ہوتے ہیں۔"

اسی بے خوفی کی تعلیم اس نظم میں ملتی ہے جس کا عنوان "خطاب بہ ظاہر شاہ (شاہ افغانستان) ہے۔

برخود از قرآن اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آب حیات
می دہد مارا پیام لاتخف
می رساند بر مقام لاتخف
قوت سلطان و میر از لا الہ
ہیبت مرد فقیر از لا الہ (مثنوی مسافر)

ترجمہ: "اگر تو ثبات چاہتا ہے تو قرآن سے آب حیات حاصل کر۔ قرآن بے خوفی کا پیام دے کر ہر خوف سے چھٹکارا دلاتا ہے۔ سلطان و میر کی قوت لا الہ ہی سے ہے اور ایک مردِ فقر اللہ ہی کے خوف سے ترساں رہتا ہے"۔

غور سے دیکھا جائے تو اقبال اپنی سکون ملت کو حرکت میں لانا چاہتے ہیں، اور ان ساری رکاوٹوں پر تیشہ کشمکش اور پیکار اور جہد و جہاد راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً خوف جو ہر طرح کی کمزوریوں اور سماجی برائیوں کی جڑ ہے۔ اس طرح مصلحت پسندی

اس بات تعلیم دیتی ہے کہ زمانہ کا رنگ دیکھ کر کام کرو اور جیسے حالات ہوں اس کے مطابق اقدام کرو۔

غرض اقبال نے قرآنی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے بے خوفی کی تعلیم دی۔ مصلحت پسندی سے نفرت دلائی ہے۔ تصادم و پیکار کی بات کہی، سکوت پسندی جو مصلحت کا لازمی تقاضہ ہے، اس سے بیزارگی کا اظہار کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اقبال خطر پسندی کی تعلیم دیتے ہیں کہ انسان خطرات سے نہ گھبرائے بلکہ ان کا خیر مقدم کرے کہ خطرات کے اندر سے انسان کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اگر حالات ناسازگار ہوں مصائب اور مشکلات کا ہجوم ہو تو انسان مایوس اور خوفزدہ نہ ہو بلکہ حکمت و تدبر سے اپنے اندر وہ صلاحیت اور اہلیت پیدا کرے کہ اپنی آرزؤں اور تمناؤں کے مطابق اپنے ماحول پر اثر انداز ہو سکے۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور اس خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

••

امامت

تُو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

سید خلیل اللہ حسینی

اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

بیسویں صدی کے جو مفکرینِ مشرق، مغربی اثرات کے ردِ عمل کے طور پر منظرِ عام پر آئے ان میں حکیم الامت علامہ اقبال سب سے ممتاز ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں اہلِ مشرق، مغربی دانش کدوں کی سیر کرتے لیکن میخانہ مغرب کے چند جرعوں میں بہک جاتے اقبال نے پورا میخانہ پی لیا مگر ان کے قدم ڈگمگانے نہ پائے۔ انھوں نے مغربی علوم کے سمندر میں شناوری کی، غوطہ زنی کی لیکن دُرہائے آبدار لیے ساحل پر آئے۔ مغرب کے اس بحرِ متلاطم سے سر اُٹھانے کی ہمت بھی بہت کم لوگوں نے کی، ساحل پر آنا تو کجا۔

یوں تو شعراء خیالات کی وادیوں میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں لیکن سچے شاعر کو تلمیذ الرحمٰن کہا گیا وہ آنے والے دور کا نقیب ہوتا ہے اس بانگِ درا سے سونے والے چل نکلتے ہیں۔ اس کی ضربِ کلیمی سے باطل کانپ اٹھتا ہے اس کے بالِ جبریل کی پرواز فلک آسا ہوتی ہے۔ اقبال دُنیا کے لیے ارمغانِ حجاز بن کر آئے۔ انھوں نے مغرب کے استیلاء اور مشرق کی زبوں حالی پر وہ نالہ آتشناک بلند کیا کہ جمود کی یخ، آتشِ سیال میں بدل گئی سونے والے جاگے، جاگنے والے چل نکلے، چلنے والے تیز گام ہوئے اور دوڑنے والے منزل آشنا ہو گئے۔

یوں تو ہندوستان نے اور بھی شاعر اور مفکر پیدا کیے جس میں رابندر ناتھ ٹیگور ممتاز مقام رکھتے ہیں اور پہلی جنگِ عظیم سے تباہ شدہ یورپ کو ٹیگور کے میٹھے نغمات اور سُریلے گیتوں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس وقت کا یورپ اقبال کی بلند آہنگی کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ ٹیگور کے نغموں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی اور ان کو نوبل پرائز ملا۔ یہ ہے

ٹیگور کے نوبل پرائز کی حقیقت جس پر ہم ہندوستانیوں کو بجا طور پر فخر ہے۔ اقبالؔ کا نقطۂ فکر یہ تھا کہ پورا مشرق، مغرب کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے اور مشرق عبارت ہے مسلمانوں سے جو ایشیا کے بیشتر مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

بیداریٔ مشرق اور آزادیٔ مشرق ان کی گفتگو کے اہم موضوعات ہیں۔ غلامی کی جتنی سخت مذمت ہمیں ان کے کلام میں ملتی ہے، مشکل سے کہیں اور نظر آتی ہے جن لوگوں نے بے وفائی کی اور ملک کو غلامی کے بندھنوں میں جکڑا، ان کا تذکرہ وہ "جاوید نامہ" میں کرتے ہیں کہ دو روحیں قلزم خوں میں جھکولے کھا رہی ہیں جنھیں دوزخ نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ روحیں میر جعفر اور میر صادق کی ہیں جن کے متعلق انھوں نے کہا ؎

جعفر از بنگال صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

اپنی مشہور نظم 'شعاعِ امید' میں انھوں نے اسی ایقان کو پیش کیا ہے کہ ہند کا ہر گوشۂ تاریک منور ہوگا خدا کا شکر ہے کہ اقبال کی یہ تمنا پوری ہوئی اور نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق کے تمام علاقے مغربی سامراجیت کے اثر سے آزاد ہو گئے۔ اقبالؔ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے شاہین کا تذکرہ کیا اور قوت کا فلسفہ پیش کیا۔ ہر عظیم مفکر کے کلام میں زندگی کے حقایق ہی ملیں گے اس کے ہاں فلسفہ دھوکہ دہی نہیں ہوگا۔ انھوں نے اس ایک مصرعہ میں اس تلخ حقیقت کو پیش کیا ہے کہ ؎

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

وہ کہتے ہیں کہ حق کی حفاظت کے واسطے بھی قوت کی ضرورت ہے اور جو قوت حق کے تابع نہیں ہوتی وہ شیطنت ہے۔ فرد اور جماعت کا مسئلہ ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے۔ لیکن فرد کی انفرادیت کی نشو و نما اور یہ نشو و نما پائی ہوئی انفرادیت (خودی) اجتماعی مفاد (بے خودی) کے تابع ہو، یہ ایک ایسا متوازن نقطۂ نظر ہے جو ہمیں صرف اقبال کے ہاں ملتا ہے اور یہ انھوں نے اسلام کی تعلیمات سے اخذ کیا ہے جس کی عملی جلوہ گری عہدِ اولیٰ میں رہی ہے۔ وہ نماز

کے تعلق سے بھی کہتے ہیں کہ سجدہ بے خودی کی علامت ہے اور قیام خودی کی علامت ہے ممکن ہے مولویوں اور مشایخین کے نزدیک یہ نقطۂ نظر قابلِ قبول نہ ہو، چونکہ وہ لوگ خودی کو مٹانے اور خود کو فنا کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مشایخوں کی محفلوں میں اقبال کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ لیکن اقبال بذاتِ خود ایک بلند پایہ صوفی تھے انھوں نے مولانا روم سے استفادہ کیا تھا جن کی کتاب مثنوی مولانائے روم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اقبال نے عبادات، مراقبے اور محافل ذکر و فکر کو جانچنے کے لیے دو معیارات بنائے ہیں ایک مقام پہ وہ کہتے ہیں یہ ذکر و فکر، یہ مراقبے، یہ سرور اگر خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اقبال حسبِ احکام الہٰی قرآنی ملت مرحوم کی ابتر حالت سے مایوس نہیں ہیں۔ اور وہ آنے والے دور کی خبر دیتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ شبِ تاریک گزر جائے گی اور خورشیدِ نو طلوع ہوگا نیا دور آئے گا ملت اسلامیہ کو تسلی دیتے ہیں کہ

کشتیِ حق کا زمانہ میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

مایوسی کی تاریکی میں اُمید کی شمع روشن ہے جمود اور بے حسی کے سرد ماحول میں ایک صدائے انقلاب اور نفسِ گرم ہے عقلیت کے دور میں آوازۂ عشق ہے، مادیت کے عالم میں اللہ ھو ہے! کمزوری اور اضمحلال کے شیدائیوں کو پیامِ قوت و شوکت ہے۔ اقبال کو زمانے نے غلط فہمیوں میں الجھا دیا ہے آج کی دنیا کے لیے بھی اُن کا یہ ارشاد سرمۂ بصیرت ہے ؎

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

••

سید خلیل اللہ حسینی

سوئے قطار می کشم...

گیسوئے اردو منت پذیر شانہ تھا، میر کی آہ دردناک دنیا نے سنی تھی، سودا کی شاعری کی واہ واہ سے باخبر تھی لیکن اقبال کی شاعری دلیلِ راہ بن کر سامنے آئی۔ اردو شعر و ادب گل کی لچکتی شاخ کی طرح نازک، پھول کی پتی کی طرح رنگیں، ساغرِ مے سے زیادہ نشہ آور اور مینائے صہبا کی طرح محرمِ مے حقیقت رہا۔ یہ حکیم الامت حضرت اقبال کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے نزاکتِ شعر و ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی اس کو فولاد کی صلاحیت عطا کی۔ رنگینیٔ ادب کا احترام کرتے ہوئے بھی اس کو خونِ دل کی سرخی بخشی کہ ادب صرف ساز کا ہم نوا نہیں بلکہ سراپا سوز بن گیا۔ ان کے ساغرِ شعر میں مئے تیز جھلکتی تو ضرور ہے لیکن اس میں کسی عشوہ و غمزہ کی کیفیات نہیں بلکہ وہ مئے توحید ہے جس کے میخانے تین سو سال سے بند تھے اور اقبال نے درِ میکدہ پہ اس طرح نغمہ خوانی کی کہ بند کواڑ کھل گئے۔ زبانِ اردو اپنی تہی دامنی کے لیے مرثیہ کناں نہیں رہی بلکہ قلقلِ مینا نے اس حقیقت کا اعلان کیا کہ اب اس کا دامن گلہائے معنی سے لبریز ہے۔ ان کی بانگِ درا نے سوئے ہوئے قافلے کو بیدار کیا۔ بالِ جبریل نے طاقتِ پرواز عطا کی۔ ضربِ کلیم نے استعماریت کو پاش پاش کیا۔ یوں تو اقبال نے بادہ و ساغر کی اصطلاحات ہی میں گفتگو کی لیکن اپنی شاعری کے مقصد کے بارے میں کہا،

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست　　　　سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

انھوں نے جمود و خمود و غفلت کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار کیا اور ان کی شاعری مردہ رگوں میں جمی ہوئی جمود کی یخی کو دور کرتی، مٹی کا ڈھیر بنے ہوئے عزائم کو رفعتِ ہمالہ کا درس سکھاتی

سونے والوں کو جگاتی، جاگنے والوں کو چلاتی، چلنے والوں کو دوڑاتی اور دوڑنے والوں کو منزل آشنا کراتی ہے۔ اقبال نقیب انسانیت تھے، ان کا شدید احساس تھا کہ وہ انسان جس کو قدرت نے اپنا شہکار بنایا، نہ اپنے مقام سے واقف ہے نہ اس کو مقام عظمت ملا ہے۔ وہ استعماری چیرہ دستی کا شکار ہے وہی ظالم اور استحصال پسند لوگ موجود ہیں جو انسانوں کو اقوام میں بانٹ کر انسان کی تباہی کا موجب ہوتے ہیں۔ جس وقت حبش پر مسولینی کی فوج حملہ آور ہوئی تو انھوں نے بڑے دکھ سے لکھا تھا کہ

تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال　　ہر گرگ کو ہے، برۂ معصوم کی تلاش
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش　　اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش　　پیر کلیسیا یہ حقیقت ہے دل خراش

اقبال نے ایک سوسائٹی کا خواب دیکھا تھا جس میں ہر انسان کو اس کی مخفی صلاحیتوں کی نشوونما کے مواقع حاصل ہوں۔ افراد اپنے تہذیبی سرمایے کی قابل فخر قدروں کو لے کر آگے بڑھیں۔ نقالی اور وابستہ درگاہ غیر کے طریقے کو ترک کریں۔ انسان کو ذہنی اور قلبی آزادی حاصل ہو اور انسان اعلیٰ مقاصد کی حصول کی کشمکش کرتا ہوا زندہ رہے۔ اقبال کے کلام کا حاصل عظمت انسانیت ہے۔ ان پر فرقہ پرستی کا لیبل لگانا صریحاً زیادتی ہے۔ ان کا کہنا ہے ؎

برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

(اقبال صدی تقاریب ۱۹۷۳ء کے موقع پر مطبوعہ سوونیر سے ماخوذ)

••

ڈاکٹر وحید عشرت
اسسٹنٹ ڈائیرکٹر (ادبیات)
اقبال اکادمی پاکستان

علامہ اقبال اور تہذیب کا روحانی مقصود

علامہ اقبال تہذیب کا حرکی تصور رکھتے تھے ان کے نزدیک کائنات کی اصل حرکت ہے۔ حرکت ہی وہ اصل الاصول ہے جو کائنات میں کارفرما ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک اسلام کی دعوت میں وہ عناصر موجود ہیں جو عقلِ استقرائی کی کارفرمائی سے ایک عظیم تہذیب برپا کر سکتے تھے۔ علامہ اقبال اسلامی تہذیب میں عقیدۂ ختمِ نبوت کو بہت اہم تصور کرتے تھے کیونکہ علامہ کے نزدیک عقیدہ ختمِ نبوت کا مطلب یہ تھا کہ

"اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہو گی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔"[1]

علامہ اقبال کے نزدیک اسلام نے انسان کے شعورِ ذات کی تشکیل کی اور انسان کو مطالعہ فطرت اور مطالعۂ تاریخ کے ذریعے علم کے نئے سرچشموں سے استفادہ کرنے کی طرف راغب کیا، اور عقل استقرائی کے ذریعے خود انسان کو مرئی سے حقیقت کے غیر مرئی تصوّر کی طرف رہنمائی کی۔ یوں اسلام نے قرآن کے ذریعے انسان کو حیات اور کائنات کے بارے میں چند اساسی اصولوں سے آگاہ کیا اور پھر اسے ایک ایسی منہاجِ حیات دی جس کے ذریعے وہ حیات و کائنات کی گتھیاں از خود سلجھا سکے اور از خود زندگی کے مسائل کی تفہیم و توضیح کر سکے۔ علامہ کے نزدیک

"قرآن مجید نے "آفاق و انفس" دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے اور اس کا ارشاد

۱۔ اقبال، علامہ سر محمد۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ص ۱۹۳

ہے کہ آیات الٰہیہ کا ظہور محسوسات و مدرکات میں خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے اور دیکھیں کہ اس سے حصولِ علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے"۔[1]

علامہ اقبال کے نزدیک قرآن حکیم نے ایک ایسی تہذیب کی اساس رکھی جس میں عقل استقرائی کا ظہور ہوا[2] اور عقل استقرائی کا یہ ظہور اسلام کا ظہور تھا اور اسلام میں نبوت اس سے اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی[3]۔ اور اسلام نے اس عقلِ استقرائی کے حوالے سے بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا۔ یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا[4]۔ اس طرح اسلام نے ایک تجربی اور استقرائی تہذیب کو جنم دیا جو عقل اور تجربے پر اپنی اساس رکھتی تھی اور قرآن کے اساسی اصولوں پر از خود پرداخت و برداشت ہو رہی تھی۔ علامہ کے نزدیک ایک ایسی تہذیب جو عقل اور تجربے پر استوار ہو اور وہ انفس و آفاق کو علم کے منابع تصور کرے وہ ایک ایسی حرکی تہذیب ہے جو از خود ارتقاء اور ترقی کی منازل طے کر سکتی ہے۔ علامہ کے نزدیک

"یہ سارا عالم فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و فکر سے کام لے۔ یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں ان اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے۔ وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ محسوس اور ٹھوس حقایق پر بار بار توجہ کی اس دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی قرآنِ مجید نے تعلیم دی"۔[5]

۱۔ اقبال۔ علامہ سر محمد۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۹۴
۲۔ — ایضاً — ص ۱۹۳
۳۔ — ایضاً —
۴۔ — ایضاً — ص ۱۹۴
۵۔ — ایضاً — ص ۱۹۶، ۱۹۷

علامہ اقبال کے نزدیک قرآن نے مطالعہ فطرت، کائنات کے اسرار و رموز سمجھنے اور اس کی تسخیر کی انسان کو راہ دکھائی۔ چنانچہ علامہ کے نزدیک یورپ نے اسلامی تہذیب کی اس روح کو پاکر جو تہذیب برپا کی جو دراصل اسلامی تہذیب کی اصل روح کی ہی توسیع تھی۔[1] مگر یورپی تہذیب چونکہ شعورِ نبوت سے ہم آہنگ نہ تھی اس لیے وہ مادی قوت اور ٹیکنالوجی سے سحر میں الجھ کر اپنی بنیادی غایت اور مقصد سے محروم ہوکر اندھی میکانکی قوت کی اسیر ہوگئی چنانچہ اس نے اپنے لیے ایک ایسی راہ کو انتخاب کیا جس کی منزل سوائے زوال اور تباہی کے اور کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ تہذیب اپنی ظاہری آب و تاب میں الجھنے کی وجہ سے اسلامی تہذیب کی اصل تحریک کو نہ پا سکی اور اس کے حقیقی جوہر، ضمیر اور باطن تک رسائی ممکن نہ رہی۔

علامہ اقبال کے خیال میں مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کے اصل جوہر یعنی انفس و آفاق کی تسخیر کے ذریعے حقیقت الٰہیہ تک رسائی کے مقصد کو تو فراموش کر گئی تاہم وہ انفس و آفاق کی تسخیر کو مقصد بنا کر اس میں الجھ کر رہ گئی۔ اس طرح مغربی تہذیب عقل محض تک محدود ہوگئی اور وہ شعورِ نبوت سے اپنے عرفانی مقام سے گر گئی۔ مغربی تہذیب کے اس نقص کی طرف اقبال مسلمانوں کو متوجہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنی تہذیب کی اساس مغربی تہذیب کے ایک ایسے ناکام تجربہ پر نہ رکھیں جسے اسپنگلر نے زوال کی وعید سنائی اور البرٹ کامیو نے اجتماعی خودکشی جس کے مسئلہ کا حل قرار دیا تھا، ڈاکٹر وزیر آغا اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> "اقبال کچھ عرصہ یورپ میں بھی رہے تھے اور وہاں انہوں نے اس مغربی تہذیب کے ٹوٹنے اور زوال آمادہ ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا جس کی اساس عقلی اور منطقی اندازِ فکر پر استوار کی گئی تھی۔
>
> تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی ❊ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

لہٰذا اب وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو بتانا چاہتے تھے کہ محض عقلی نظام

۱۔ اقبال، علامہ سر محمد۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۱
"مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔"

پر انحصار روحانی افلاس کا پیش خیمہ ہے جب تک عقلی رویے کے ساتھ وجدانی اندازِ نظر بھی پیدا نہ ہو کوئی تہذیب مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتی اور نہ کوئی قوم ارتقا کی دوڑ میں آگے بڑھ سکتی ہے۔ ادھر خود مغرب میں بھی صورت حال تبدیل ہو رہی تھی اور عقل و خرد کا دامن سمٹ رہا تھا"۔[1]

علامہ اقبال نے اپنے قیام یورپ میں مغربی تہذیب کے مستقبل کے بارے میں جو اندازے لگائے تھے وہ اتنے درست ہیں کہ اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ یورپی اور مغربی تہذیب کی تمام تر توانائیاں اور تمام تر عمل اس بات پر مرتکز ہو گیا ہے کہ وہ انسان کی ہلاکت کے زیادہ سے زیادہ زود اثر آلات وسامان تیار کر رہی ہے حتیٰ کہ اس کی تسخیر کائنات کے پیچھے بھی اپنے دشمن کو زیر کرنے کا جذبہ کار فرما ہے مغربی تہذیب نے انسان کو اسلحہ اور وہ بھی سریع الاثر اسلحہ کے آتش فشاں پر لا کھڑا کیا ہے جو کسی ایک بھی جذباتی اور ناداں انسان کے ماچس کی تیلی دکھانے پر بھڑک سکتا ہے بلکہ ایک بٹن جان بوجھ کر یا غلطی سے دب جانے سے پوری دنیا آگ کے شعلوں کی نذر ہو سکتی ہے اس تہذیب کا یہ المیہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے کائنات کی مرئیت کو غیر مرئیت یا مرئی حقیقت کو غیر مرئی حقیقت کو جاننے کا آلہ تصور کرنے کی بجائے مرئی حقیقت کو ہی اصل تصور کر لیا ہے اور وہ مرئی حقائق کے پندار اور حصار میں اسیر ہو کر رہ گئی ہے۔

علامہ اقبال یورپی یا مغربی تہذیب کے اس المیہ کے اظہار کے بعد اسلامی تہذیب و ثقافت کی غایت بتاتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی ساری عمارت اسلام کے تصور توحید پر کھڑی ہے۔ اسلامی تہذیب توحید کے عمرانی الطاقات کی مظہر ہے اور اس تہذیب کا مقصد ایسے عمرانی اور سماجی اسباب و مظاہرات کی نمو پذیری ہے جس میں انسان انفس و آفاق کی تفہیم کے ذریعے مرئی حقیقت کے ابلاغ سے غیر مرئی حقیقت سے شاد کام ہو سکے اور غیر مرئی حقیقت یعنی خدا کی ذات کا عرفان حاصل کر کے اپنی روح کا استخلاص حاصل کر سکے۔ تمام عالم اسباب انسان کی روح کے

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، تصوراتِ عشق و خرد ص ۱۱۱

اس استخلاص کا راستہ ہے۔ اسلامی تہذیب میں علم بھی بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ اور دروازہ ہے اور علم کا مقصد انسان کو اس کائنات کی تخلیق کی اصل غایت اپنے اس کائنات میں مقام اور کائنات کی غیر مرئی حقیقت کے عرفان سے بہرہ ور اس کی روح کا استخلاص ہے۔ چنانچہ اسلامی تہذیب کے پاس توحید کا تصور وہ بنیادی اصول ہے جس کی نوعیت عالم گیر ہے اور جس سے انسانی معاشرے کا ارتقا روحانی اساس پر ممکن ہے اور اسی اصول سے فرد کا روحانی استخلاص وابستہ ہے اور اسی اصول پر کائنات کی روحانی تعبیر ممکن ہے۔ یہی اصول علامہ اقبال اس سوال کا جواب ہے جو انہوں نے چھٹے خطبہ الاجتہاد فی الاسلام میں اٹھایا ہے[1] اور اسی اصول پر علامہ اقبال ان کی حیات اجتماعیہ کی ازسرِنو تشکیل چاہتے تھے۔ جو اپنی معاشری اور عمرانی صورت حال میں روحانی جمہوریت کی صورت میں متشکل ہوتا ہے[2]۔ پروفیسر محمد عثمان علامہ اقبال کے اسلامی تصورِ تہذیب و ثقافت کی وضاحت کرتے ہوئے بھی اسی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

"اسلامی ثقافت پر گفتگو کا آغاز بالعموم نظریہ توحید سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اسلامی فکر و کردار کی ساری عمارت توحید پر قائم ہے۔ قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ وہ پوری کائنات کا خالق و مالک اور رب ہے۔ اس دنیا یا کسی اور دنیا کی کوئی شئے اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں۔ سب انسان آدم کی اولاد ہیں اور سب خدائے واحد کی مخلوق ہیں۔ اسلام سے پہلے کے بعض مذاہب نے بلاشبہ خدا کے واحد ہونے کی تعلیم دی تھی مگر یہ اسلام ہی ہے جس نے توحید سے انسانی وحدت کا بنیادی اصول اخذ کر کے اسے ایک معاشرتی حقیقت بنایا جب ساری کائنات کا، سب انسانوں کا بنانے والا ایک ہے تو پھر انسانوں کے درمیان رنگ"

۱۔ محمد اقبال۔ تشکیل جدید۔ ص ۲۷۵
۲۔ ۔ ایضاً ۔ ص ۲۷۷

نسل، قومیت یا زبان کی بنا پر امتیاز کیسا؟ کالے بھی اس کی مخلوق ہیں اور گورے بھی۔ سامی بھی اس نے پیدا کئے ہیں اور آریا بھی۔ اسی طرح سب زبانیں اس کی دین ہیں۔ لہٰذا انسان ہونے کی حیثیت سے تمام نسلوں، تمام رنگوں اور تمام زبانوں کے انسان برابر ہیں۔ انسانوں کی اس برابری کو معاشرے میں عملاً نافذ کرنا اسلامی ثقافت کا نقطۂ آغاز ہے"۔[1]

پروفیسر محمد عثمان نے توحید کی جس معاشرتی اطلاقیت کو اسلامی تہذیب کا اصل الاصول قرار دیا ہے وہ اسلامی ثقافت کا اور اسلامی تہذیب کا اساسی جوہر ہے اس اسلامی ثقافت و تہذیب کے نتیجے میں طہارت کردار معاشرے میں نمو پاتی ہے۔ پروفیسر محمد عثمان کے بقول اسلامی ثقافت جنسی پاکیزگی اور مغربی تہذیب کی جنس کی بے راہ روی سے عبارت ہے۔ اسلامی ثقافت کی اہم خصوصیت عدل و انصاف ہے۔ پروفیسر محمد عثمان لکھتے ہیں:

"انسانی مساوات اور جنسی پاکیزگی کے ساتھ اسلامی ثقافت کی ایک اہم ترین خصوصیت اس کا عدل و انصاف پر زور ہے انصاف کی تلقین دوسرے مذاہب اور معاشروں میں بھی ملتی ہے مگر اسلامی ثقافت کا امتیاز یہ ہے کہ وہ دوستوں کے ساتھ ہی نہیں دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کیے جانے پر مصر ہے۔ قرآن حکیم (جو اسلامی ثقافت کا سرچشمہ اور اولین ماخذ ہے) مسلمانوں کو تسلیم دیتا ہے کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرپاؤ۔ انصاف کرو کیونکہ اللہ کو انصاف پسند ہے"۔ (المائدہ: ۸)[2]

اسلامی ثقافت کے اصل توحیدی ان معاشرتی تعبیرات کے ساتھ ساتھ اسلامی ثقافت کی اصل روح اور اسلامی تہذیب کی اصل کیا ہے؟ علامہ اقبال کے سامنے یہ سوال بھی بہت اہم

۱۔ پروفیسر محمد عثمان، فکر اسلامی کی تشکیل نو، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۱۹۸۵ء ص ۱۲۳، ۱۲۴

۲۔ ـــــ ایضاً ـــــ ص ۱۲۴

تھا چنانچہ اگر علامہ کے خطبے اسلامی ثقافت کی روح کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی روح کی تفہیم ان تصورات پر غور کرنے سے سمجھ میں آسکتی ہیں جو اسلامی تہذیب و ثقافت میں کارفرما ہیں[1]۔ علامہ نبوت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ شعور ولایت کی وہ شکل ہے جس میں وارداتِ اتحاد اپنے حدود سے تجاوز کر جاتیں اور اُن قوتوں کی پھر سے رہنمائی یا از سرِ نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیاتِ اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ گویا انبیا کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے تو اس لیے کہ پھر ایک تازہ قوت اور زور سے ابھر سکے وہ ماضی کو مٹاتا اور پھر زندگی کی نئی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے[2]۔ علامہ اقبال کے نزدیک اسلامی ثقافت و تہذیب کی اساس شعورِ نبوت ہے اسی شعورِ نبوت پر انسانی تہذیب و تمدن کی تشکیل انسانی مسئلہ کا حل ہے۔ یہ شعورِ نبوت حیاتِ اجتماعیہ کے چند اساسی اصولوں یا زاویہ نگاہ یا طرزِ سوچ پر محیط ہے جس سے استقرائی سوچ کے ذریعے انسان از خود اپنی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل کر سکتا ہے۔ یہ شعورِ نبوت انسان کو روحانی طور پر مستفید کرتی ہے۔ مغرب کا المیہ اسی شعورِ نبوت سے محرومی اور روحانی افلاس ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا علامہ اقبال حوالے سے اس ساری صورت حال کا نہایت فاضلانہ طریقے سے تجزیہ کرتے ہیں۔

" اقبال کی سائیکی میں تیرہ سو برس کی اسلامی تہذیب اور ہزارہا برس کی مشرقی تہذیب کے بنیادی عناصر موجود تھے جو ایک دوسرے میں جذب ہو کر اس جوہر کی صورت میں ابھر آئے تھے جو اصلاً اور مزاجاً مشرقی تھا۔ اس جوہر کے اجزائے ترکیبی میں یوں تو لاتعداد عناصر شامل تھے لیکن مذہبی، صوفیانہ اور جمالیاتی عناصر بالخصوص بہت زیادہ نمایاں تھے بے شک یہ عناصر ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن ان تینوں

۱۔ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۹۵
۲۔ — ایضاً — ص ۱۹۵

کا رُخ ایک ہی طرف تھا یعنی درا اور اسے ہم رشتہ ہونا ان کا بنیادی مسلک تھا اور تینوں منزل تک پہنچنے کے لیے وجدان کو ایک بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اقبال کے ہاں عشق کو اہمیت دینے اور عقل کے مقابلے میں وجدان کو حقیقت کی تفہیم میں سب سے اہم حربہ قرار دینے کا میلان خون اور نسل اور تہذیب کی راہ سے آیا تھا، اور اس لیے اس کی جڑیں سرزمینِ مشرق میں بہت دور تک اتری ہوئی تھیں۔ چنانچہ اقبال کی شاعری میں مغربی تہذیب کو ہدفِ طنز بنانے کی روش اور عقلی اندازِ فکر کو وجدانی اندازِ فکر کے مقابلے میں کم تر قرار دینے کا رویہ بنیادی طور پر اس مشرقی تہذیب کا ہی عطیہ تھا جس نے مادی مقاصد پر روحانی مقاصد کو ہمیشہ ترجیح دی تھی بلکہ مادے کی ٹھوس دنیا کو فنا آشنا اور غیر حقیقی اور اس کے پس منظر میں پھیلی ہوئی غیر مادی فضا کو لافانی سمجھا تھا۔ اقبال کے زمانے میں مغربی تہذیب اور اس کے سائنسی اندازِ نظر اور مادہ پرستی کے رجحان نے جس شد و مد کے ساتھ مشرقی تہذیبوں پر یلغار کی تھی اس سے اقبال کے ذہن میں یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں مادہ پرستی کی یہ آندھی روحانیت کی اس شمع ہی کو گل نہ کر دے جسے مشرق نے ہزارہا برس سے بجھنے نہ دیا تھا۔ اقبال کا یہ احساس کس قدر صادق اور بر وقت تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آج مغرب میں اس بات کا کھلے بندوں اظہار ہونے لگا ہے کہ روحانیت کا سرچشمہ مشرق میں ہے اور اگر مغربی تہذیب کو اپنے روحانی بنجرپن سے نجات پانا ہے تو اسے مشرق ہی کی طرف دیکھنا ہوگا"۔[1]

اس طرح علامہ اقبال اسلامی ثقافت کی اصل روح ایسے علم کو قرار دیتے ہیں جس کا یقینی سرچشمہ پیغمبرانہ وحی ہے۔ جو قرآن حکیم کی صورت میں ہماری ہدایت کے لیے موجود ہے۔ قرآن نے ہی علم کے دیگر دو معتبر ذرائع کا سراغ دیا جو انسان پر پہلے اس اہمیت کے ساتھ منکشف نہ تھے۔

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ تصوراتِ عشق و خرد ص ۱۱۲، ۱۱۳

ان میں سے ایک فطرت ہے تو دوسرا ذریعہ علم تاریخ ہے ۔ اسلامی تہذیب مطالعۂ فطرت اور مطالعۂ تاریخ کے ذریعے کائنات اور انسانی حقیقتوں پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور شعورِ نبوت کی ان کے ذریعے تصدیق و تشکیل عمرانی تناظر میں کرتی ہے ۔ اسی مطالعۂ فطرت سے مسلمانوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اساس رکھی اور اسی مطالعۂ تاریخ سے مسلمانوں نے عمرانی علوم کی حقیقت دریافت کی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ مسلمانوں نے تہذیب جدید کی اساس رکھی ۔ علامہ مغرب کے جدید حاصلات کے اسلامی منابع کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"یہ آکسفورڈ سکول میں ان (عربوں) کے جانشین ہی تھے جن سے راجر بیکن نے عربی اور عربی سائنس کی تعلیم پائی ۔ لہٰذا تجربی طریقے کی ابتداء کا فخر نہ تو راجر بیکن کو حاصل ہے اور نہ اس کے ہم نام فرانسس بیکن کو ۔ راجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ وہ مسلم سائنس اور طریقۂ علم کو عیسائی یورپ تک پہنچانے والوں میں ایک تھا اور یہ اعلان کرتے وہ کبھی نہ تھکتا تھا کہ اس کے ہم عصروں کے لیئے سچے علم تک رسائی حاصل کرنے کا بس یہی ایک راستہ ہے کہ عربی زبان اور عربی علوم سیکھیں" ۔[1]

علامہ مزید لکھتے ہیں،

"سائنس عربوں کا بہترین تحفہ ہے جو انھوں نے جدید دنیا کو عطا کیا" ۔[2]

رابرٹ بریفالٹ نے تو اپنی کتاب تشکیل انسانیت میں مسلمانوں کے جدید یورپ پر احسانات کا بار بار ذکر کیا ۔ ممتاز اشتراکی مفکر فریڈرک اینگلز بھی عربوں یعنی مسلمانوں کے جدید علوم پر احسانات کا معترف تھا ۔[3]

---

۱ ۔ محمد اقبال، تشکیلِ جدید ص ۲۰۲
۲ ۔ —— ایضاً —— ص ۲۰۲
۳ ۔ فریڈرک اینگلس ۔ فطرت کی جدلیات ۔ دار الاشاعت ۔ ماسکو

مغربی علوم کی تجربی اساس مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک تو مذہبی تجربہ بھی فکر سے مملو ہے اور یہ دیگر سائنس اور عمرانی تجربات کی طرح ہی معتبر ہے اور وجدان بھی فکر ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے[1]۔ وجدان اگر بیک وقت تمام حقیقت سے لطف اندوز ہونے کا طلب گار ہے تو فکر اس راستے پر رک رک کر قدم اٹھاتا اور اس کے مختلف اجزا کی تخصیص و تحدید کرتا چلا جاتا ہے تاکہ فرداً فرداً ان کا مشاہدہ کر سکے۔ دونوں اپنی تازگی اور تقویت کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں[2]۔ علامہ اقبال کے نزدیک مغرب کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے فکر کے وجدانی پہلو کو فراموش کر دیا اور یوں وہ فکر کی روحانی تنویر سے محروم ہو کر صرف مادی آلائشوں کے اسیر ہو کر رہ گئے جب کہ مسلمانوں پر پچھلے پانچ سو برس سے جمود کی ایک کیفیت طاری ہے پچھلی متعدد صدیوں میں جب عالم اسلام پر ذہنی غفلت اور بے ہوشی کی نیند طاری تھی یورپ نے ان مسائل پر نہایت گہرے غور و فکر سے کام لیا[3]۔ یوں عالم اسلام اپنی فکر کی وجدانی تنویر سے محروم ہو گیا۔ اور یورپ نے چونکہ اسلام کے شعور نبوت کو قبول نہ کیا تھا اس لیے وہ مادہ کے جنگل میں حیرت زدہ ہو کر گرفتار ہو گیا اور یوں ایک بے مقصد اور بے غایت تہذیبی ارتقا کے ذریعے اپنی تباہی کی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

اسلامی ثقافت کی روح عقل استقرائی کو قرار دیتے ہوئے علامہ اقبال مسلمانوں کے سائنسی، مادی اور علمی حاصلات کو بیان کرتے ہیں جنھوں نے موجودہ کمال تک پہنچنے میں یورپ کی رہنمائی کی۔ اس کے بعد علامہ اقبال عہد جدید کے مسلمانوں کو مطالعۂ فطرت اور مطالعہ تاریخ کی دعوت دیتے ہیں اور شعور نبوت کی روشنی میں توحید کے عمرانی اطلاقات کرتے کرتے ہوئے ایسے اداروں کی تشکیل کی دعوت دیتے ہیں جس سے انسانی معاشرے کو روحانی تنویر میسر ہو سکے اور فرد کا روحانی استخلاص ممکن ہو۔ یوں علامہ اقبال علم کو اسلامی ثقافت کی روح قرار دیتے ہیں اور اس علم کے منابع شعور نبوت، مطالعہ فطرت اور مطالعہ تاریخ کو قرار دیتے ہیں جس کی قرآن نے خود بار بار دعوت دی۔ بقول پروفیسر محمد عثمان علامہ

۱-۲ محمد اقبال۔ تشکیل جدید ص ۴

۳- ـــــ ایضاً ـــــ ص ۱۱

کی خواہش اس سے یہ تھی کہ اب

"عالم اسلام کا نہایت اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے ورثے کو دوبارہ حاصل کرے کیونکہ از روئے قرآن حکیم محسوس اور متناہی کے علم ہی سے وہ قوت ہاتھ آتی ہے جس کی بدولت زندگی کے بگڑتے کاج سنورتے ہیں اور سچی انسانیت کی شمع روشن ہوتی ہے" [1]

علامہ اقبال کے نزدیک اسلامی تہذیب کی اساس علم کے حصول کے ذریعے ہی ممکن ہے اور تجربی علم ہی اسلامی تہذیب کی روح ہے۔ عقل استقرائی کا ظہور اسلام کا ظہور ہے اور آج بھی اسلامی تہذیب اپنا ارتقا چاہتی ہے تو اسے عقل استقرائی اور تجربی علم کو اپنانا ہوگا۔ جن پر اسلامی تہذیب نے پہلے بھی اپنی عظمت کی اساس رکھی تھی اور جدید مغربی تہذیب نے جس سے رہنمائی حاصل کی تھی۔ علامہ اقبال نے زوالِ مغرب کے معروف مصنف فریڈرک اشپنگلر کے اس نظریہ کو بھی غلط قرار دیا کہ تہذیبیں بھی جسم نامی کی طرح ہیں جس طرح جسم نامی پر بچپن، جوانی اور بڑھاپا طاری ہوتا ہے اسی طرح تہذیب بھی جسم نامی کی طرح ان مراحل سے گذر کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں پھر جس طرح جسم نامی دوبارہ مرنے کے بعد وجود میں نہیں آسکتا، اسی طرح کوئی تہذیب بھی مرنے کے بعد دوبارہ جنم نہیں لے سکتی۔ فریڈرک اشپنگلر اپنے اس طرزِ استدلال سے کہنا یہ چاہتے تھے کہ اب اسلام بھی قصۂ پارینہ بن چکا ہے اور ایک تہذیبی قوت کے بطور اس کے ابھرنے کے امکانات موجود نہیں ہیں۔ علامہ اقبال نے جرمنی کے اس تاریخ کے مفکر کے اس نظریہ کو رد کرتے ہوئے کہا

"اشپنگلر اس غلط فہمی کا ازالہ باقی ہے جسے اشپنگلر نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "زوالِ مغرب" میں پھیلایا ہے۔ اس تصنیف کے ان دو ابواب کو جن

---

[1] پروفیسر محمد عثمان۔ فکرِ اسلامی کی تشکیل نو ص ۱۵۰

میں اس نے عربی ثقافت سے بحث کی ہے ایشیا کی تہذیب تمدن کی تاریخ میں ایک بڑا قابل قدر اضافہ تصور کرنا چاہیئے ۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اشپنگلر نے ان دونوں ابواب میں یہ سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کی کہ بحیثیت ایک مذہبی تحریک اسلام کی ماہیت کیا ہے ؟ نہ یہ کہ وہ کیا سرگرمیاں تھیں جن کا اس کی بدولت تہذیب و ثقافت کی دنیا میں آغاز ہوا۔ اشپنگلر کا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی تہذیب ہو اسے اپنی جگہ پر ایک جسم نامی تصور کرنا پڑے گا۔ اس لیئے کہ زماناً دیکھا جائے تو کسی تہذیب کا اس تہذیب سے جو اسی سے متقدم ہے یا متاخر کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اشپنگلر کے نزدیک ہر تہذیب کا اپنا ایک نقطہ نظر ہوتا ہے اور وہ جس شئے کو دیکھتی ہے۔ اسی نقطہ نظر کے ماتحت جسے دوسری تہذیبوں کے افراد سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ دعویٰ ہے جس کی حمایت میں اشپنگلر کا اضطراب اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ وہ ہر ایک واقعے کے بعد دوسرا اور ایک تعبیر کے بعد دوسری تعبیر پیش کرتا اور اور اس طرح واقعات و تعبیرات کا ایک طومار کھڑا کر دیتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ مغربی تہذیب کی مخالف یونانیت روح اس کی اپنی فطانت اور ذہانت کا نتیجہ ہے کہ ان اثرات کا جو بہت ممکن ہے اس نے اسلامی تہذیب سے قبول کیے ہوں کیونکہ یہ تہذیب، کیا باعتبار روح اور کیا باعتبار نوعیت اشپنگلر کے نزدیک خالصتاً مجوسی ہے ۔ تہذیب حاضر کے بارے میں تو ہمیں اشپنگلر کے نقطہ نظر سے پورا اتفاق ہے لیکن جیسا کہ ہم ان خطبات میں بار بار کہہ چکے ہیں عصر حاضر کی روش اگر یونانیت کے مناقی ہے تو اس کی ابتدا دراصل اس بغاوت سے ہوئی جو عالم اسلام نے فکر یونان کے خلاف کی مگر اشپنگلر اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتا ہے ؟ کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ تہذیب جدید کی مخالف یونانیت روح سچ مچ ان اثرات کا نتیجہ ہے جو اس نے اپنے پیش رو تہذیب سے قبول کیے تو تہذیبوں کی باہم دگر آزادی اور جداگانہ نشو و نما کے متعلق اشپنگلر کا دعویٰ

یک قلم باطل ہو جائے گا۔ میری رائے میں اشپنگلر کا یہی اضطراب کہ وہ اپنے اس دعویٰ کو کسی نہ کسی طرح صحیح ثابت کر سکے۔ اس امر کا باعث ہوا کہ بہ حیثیت ایک ثقافتی تحریک اس نے اسلام کو بڑی ہی غلط اور فاسد نگاہوں سے دیکھا۔

بہر حال مجوسی تہذیب سے اشپنگلر کی مراد وہ مشترک تہذیب ہے جو بقول اس کے مجوسی مجموعۂ مذاہب یعنی یہودیت، قدیم کلدانی مذہب ابتدائی عیسائیت زرتشتیت اور اسلام پر مشتمل تھی اب اگرچہ اس امر سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام پر بھی مجوسیت کا ایک غلاف ضرور چڑھ گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان خطبات میں میری برابر یہ کوشش رہی ہے کہ مجوسیت کے ان غلافوں کو ہٹا کر جنھوں نے گویا اسلام کی حقیقی روح پر پردہ ڈال رکھا ہے اور جو اشپنگلر کی گمراہی اور غلط روی کا باعث ہوئے ہم اس کا صاف ستھرا چہرہ دیکھ سکیں۔ چنانچہ زمانے ہی کی بحث میں اسلامی افکار کے متعلق اشپنگلر کی بے خبری کا جو عالم ہے اسے علی ہذا محسوسات و مدرکات کے ایک آزاد اور با اختیار مرکز کی حیثیت سے خودی یا انا کا اظہار اسلام کے مذہبی مشاہدات اور واردات میں جس طرح ہوا اس باب میں اس کے خیالات کو دیکھ کر ہمارے تعجب اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی بجائے اس کے کہ زمانے کی ابتدا اور انتہا کے بارے میں اشپنگلر اسلامی افکار اور واردات کی تاریخ پر نظر رکھتا اس نے اس مسئلے میں اپنے فیصلوں کی بنا عام عقائد پر رکھی ذرا خیال تو فرمائیے کہ اسلام کی مفروضہ تقدیر پرستی کے ثبوت میں اشپنگلر ایسا پڑھا لکھا اور فاضل انسان بعض مشرقی اقوال اور ضرب الامثال کو، مثلاً زمانے کی جست، یا یہ کہ "ہر چیز کا ایک وقت ہے" بطور دلائل پیش کرتا ہے، بہر حال اس مسئلے میں مسلمانوں کے یہاں زمانے کا تصور کا سرچشمہ کیا تھا۔ علاوہ ازایں یہ کہ اس کا نشو و نما کس رنگ میں ہوتا رہا، پھر ایسے ہی سطور ایک آزاد اور با اختیار طاقت کے انسانی خودی کی بحث میں ہم ان خطبات میں بہت کچھ کہہ آئے ہیں یوں بھی

اسلام اور اسلامی تہذیب کے بارے میں اشپنگلر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی تحقیق و تنقید کے لیے ایک دفتر چاہیئے لہٰذا ہم اس سلسلے میں جو کچھ عرض کر چکے ہیں اس میں صرف ایک بات کا اضافہ، جس کی حیثیت ایک عام اصول کی ہے، کافی ہوگا۔

اشپنگلر کہتا ہے تعلیمات نبوی کا لب لباب مجوسی ہی تو ہے۔ خدا ایک ہے۔ اسے یہواہ کہیے، اہورمزد، یا مردوک بعل، وہی اصل خیر ہے باقی سب یا تو بے بس ہیں یا محض شر۔ پھر اس عقیدے کے ساتھ ایک اور عقیدہ بھی وابستہ ہے یعنی یہ امید کہ مسیح آئے گا جس کا اشعیاہ میں تو واضح طور پر اور پھر ایک خاص ضرورت کے ماتحت آئندہ صدیوں میں بار بار ذکر آتا ہے یہ مجوسی مذہب کا بنیادی خیال ہے کیونکہ اس نے تاریخ عالم کا تصور ہی اس طرح کیا ہے کہ اس کا آغاز خیر و شر کی آویزش سے ہوا جس میں مسیح کا دور اگرچہ شر کے غلبے کا دور ہے لیکن روز جزا میں خیر ہی کی فتح ہوگی۔ اب اگر اشپنگلر یہ سمجھتا ہے کہ تعلیمات نبوی کی بحث میں اس کا یہ نظریہ اسلام پر بھی منطبق ہو سکتا ہے تو اس سے بڑھ کر غلط فہمی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہاں جو بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ مجوسی بہر حال خدایان باطل کے وجود کا قائل تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے ان کی عبادت سے انکار تھا لیکن اسلام نے تو خدایان باطل کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا۔ نہ تو اشپنگلر یہ سمجھا، نہ اسلام کے اصول خاتمیت کی تہذیبی قدر و قیمت اس پر واضح ہو سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امید اور توقع مجوسی تہذیب و ثقافت کی ایک مستقل روش ہے یعنی زرتشت کے نازائیدہ بیٹوں کے ظہور کا مسلسل انتظار، خواہ کوئی مسیح ہو یا انجیل یوحنا کا فارقلیط، لیکن جو طالب علم یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ اسلام کے اصول خاتمیت کے معنی تہذیب و ثقافت کے لیے کیا ہیں تو اس کو چاہیئے اس سمت کا رُخ کرے جس کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ

کر آئے ہیں اس لیے کہ یہ اصول مسلسل انتظار کی اس مجوسی روش کے خلاف جس سے تاریخ کا ایک غلط نظریہ قائم ہو جاتا ہے ایک نفسیاتی روک بھی ہے ۔ دراصل ابن خلدون نے تاریخ کا جو نظریہ قائم کیا وہ اس کی حقیقی روح کو خوب سمجھ گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اسی نوع کے ایک اسلامی عقیدے کی تنقید سے جس نے مسلمانوں میں گویا مجوسی خیالات کے زیر اثر سر اٹھایا تھا، ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیا کہ اور نہیں تو کم از کم ان نتائج ہی کے اعتبار سے جو بلحاظ نفسیات اس سے مترتب ہوتے ہیں اسلام میں اس کی کوئی جگہ نہیں[1]

یوں علامہ اقبال نے اشپنگلر کے اس نظریہ کی جڑ کاٹ دی کہ اسلام مجوسی کلچر کا حصہ ہے اور تہذیبیں جسم نامی کی طرح ہیں اور وہ ایک مرتبہ ختم ہو کر دوبارہ اٹھ نہیں سکتیں ۔ علامہ اقبال نے کہا کہ وہ مذہب جو جسم نامی کے بھی حیات بعد الموت پر یقین رکھتا ہے وہ تہذیبوں کے دوبارہ جنم لینے کے تصور سے کیوں کر متفکر ہو سکتا ہے۔ دراصل مغرب اس طرح کے علمی اور نفسیاتی ہتھکنڈوں سے مسلمانوں کا نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں کو سبوتاژ کرنا چاہتا تھا۔ اقبال نے مغرب کی اس شرارت کو بھانپ لیا اور اس کی جڑ کاٹ دی اور اس یقین کا اظہار کیا کہ عقل استقرائی اور تجربی منہاج فکر اپنا کر مسلمان پھر اپنی اس تہذیب کو بار آور کر سکتے ہیں جس نے صدیوں نسل انسانی کی رہنمائی کی تھی ۔ اور مغربی تہذیب کے ثمرات دراصل اسی اسلامی تہذیب کے حاصلات پر مشتمل ہیں ۔ تہذیب اسلامی کا یہ حرکی تصور اقبال کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس نے مغرب کی مرعوبیت اور مسلمانوں کی مایوسی کو امید، امنگ اور جوش عمل میں بدل دیا اور اقبال ہی کے الفاظ میں

ایک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند[2]

۱۔ علامہ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ص ۲۱۸ تا ۲۲۲
۲۔ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۸۵

اقبال نے مسلمانوں کو اس ولولۂ تازہ سے مغرب کے نو آبادیاتی نظام کے تار و پود بکھیرنے اور اپنی تہذیب کے احیا کا حوصلہ بخشا۔ چنانچہ آج مغربیت اور اسلامیت میں کشمکش اور اسلامیت کی مغربیت کے بارے میں ثابت قدمی مغربی تہذیب کے زوال اور اسلامی تہذیب کے عروج کی حقیقت میں بدل رہی ہے۔

فریڈرک اشپنگلر نے دراصل دنیائے تہذیب کی تین حصوں میں تقسیم کی تھی۔ ایک تہذیب اس کے نزدیک قدیم تہذیب تھی جو یونان اور ہندوستان میں وجود پائی تھی۔ اس کلچر کی روح اس کے نزدیک اپالو کے اوصاف پر مشتمل تھی جس میں انسان اندر کی جانب جھانکتا ہے اس تہذیب میں مرکز کو اساسی اہمیت حاصل ہے اور یہ تہذیب یہ مرکز کے گرد ہی اپنے تار و پود بُنتی ہے۔ اس کلچر کو اشپنگلر کلاسیکی کلچر بھی کہتا ہے۔ اس کلاسیکی کلچر کا فرد ماضی و مستقبل سے بے نیاز صرف حال میں موجود ہوتا ہے اور حیات کی بے ثباتی اس کے شعور میں گہرے طور پر جاگزیں ہوتی ہے، اس کلچر یا تہذیب کے ماننے والے حیات بعد الموت سے بھی منکر ہوتے ہیں۔ یونانی اور ہندوستانی کی تہذیب میں مُردوں کو جلانے کا تصور حیات بعد الموت سے انکار کا ہی شاخسانہ تھا۔ خدا کی وحدانیت کی بجائے بت پرستی اس تہذیب کا ایک خاصہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تہذیب اپنے تفکر کے اعتبار سے بھی اور نتائج کے لحاظ سے بھی اسلام سے متصادم ہے۔ لہٰذا اقبال کلاسیکی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں امتیاز برتتے تھے۔

فریڈرک اشپنگلر کے نزدیک دوسری تہذیب مجوسی تہذیب تھی۔ اس تہذیب میں ایک خدا کا تصور بڑا نمایاں ہے کائنات کی علت اولیٰ خدا ہے جو کسی اور علت کے تابع نہیں۔ خیر، روشنی اور شر اس تہذیب میں اندھیرے کی علامتیں ہیں۔ یہ خیر و شر آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ خدا نیکی اور شیطان شر کی علامت ہے۔ نیکی کے لیے جزا اور بدی کے لیے سزا اس تہذیب کا خاصہ ہے۔ اسی تہذیب کا فرد اجالے کا منتظر رہتا ہے اور تاریکی سے الجھتا رہتا ہے۔ اور اس کے لیے وہ خدا سے مدد کا خواہاں رہتا ہے۔

اشپنگلر کے نزدیک تیسری تہذیب یورپی ہے جو ایک بے قرار روح سے عبارت ہے جسے وہ فاوسٹین تہذیب کہتا ہے۔ کیا اور کیسے کا سوال اس تہذیب کو ہر دم متحرک رکھتا ہے اور اس تہذیب کا ہر فرد ہر وقت کھوج اور تلاش میں رہتا ہے۔ سائنس کا سارا ارتقا اسی کیا اور کیسے کا رہین منت ہے۔ اس کی سوچ استقرائی اور سائنسی ہے۔ اس تہذیب کے فرد ایک بے قرار روح ہر وقت احساسِ تنہائی میں مبتلا رہتی ہے فرد اور معاشرے کے علاوہ فرد اور فرد میں بھی ایک خلیج حائل ہوتی ہے۔ اس تہذیب میں کھڑکی کی علامت تجربے کو منعکس کرتی ہے۔ تحریک اور جہت کی نشان دہی کرتی ہے۔

علامہ اقبال نے اشپنگلر کی اس تقسیم کو کلیتہً قبول نہیں کیا۔ انہوں نے کلاسیکی تہذیب کو مغربی اور اسلامی تہذیب سے مختلف مان لیا مگر تہذیبوں کی اس طرح الگ تھلگ جزیروں میں تقسیم انہیں درست نظر نہ آئی۔ علامہ کے نزدیک یورپی کلچر بھی دراصل یونانی کلچر کی ہی توسیع تھی۔ اس تہذیب میں بے قرار روح اور کھڑکی اسلام نے کھولی اور یہ اس بغاوت سے پیدا ہوئی جو مسلمانوں نے یونانیت کے خلاف قرآن کی تعلیمات کے تحت کی۔ قرآن حکیم نے مطالعہ فطرت اور مطالعہ تاریخ کے ذریعے جس استقرائیت کو جنم دیا اس سے یونانی استخراجیت سے ہٹ کر یورپی تہذیب عقل استقرائی کی طرف آئی۔ چنانچہ یورپی تہذیب کا یہ جوہر جو کیا اور کیسے پر مشتمل ہے اسلامی تہذیب کا ہی عطیہ ہے۔ اقبال کے نزدیک اشپنگلر نے محض ایک علاقہ میں موجودگی کے حوالے سے اور چند ظواہر کی بنا پر مجوسی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں امتیاز نہیں کیا حالانکہ اپنے اصل میں اسلامی تہذیب مجوسی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ عربوں اور اندلس کے راستے سے جب اسلامی تہذیب یورپ پہنچی تو اس نے وہاں بھی یونانی تہذیب کی کلاسیکیت کے خلاف ایک بغاوت کو برپا کر دیا۔ احیائے اعلوم اور اصلاح کلیسا کی تحریکوں کو پیچھے وہی ہل چل تھی جو اسلامی تہذیب نے انگیخت کی تھی۔ یوں اسلامی تہذیب اور یورپی تہذیب اپنے استقرائی مزاج میں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔ اقبال نے نہ صرف مجوسی تہذیب اور اسلامی تہذیب

میں حد فاصل قائم کی بلکہ مغربی اور اسلامی تہذیب کے اصل جوہر کو بھی منکشف کیا کہ مغرب کے تجرباتی استقرائی اور عقلی رویّے اسلامی تہذیب کے لیے برگ و بار ہیں اور یہ رویّے جو اسلامی تہذیب کا امتیاز ہیں مغرب کو اسلام ہی سے ملے۔ تاہم مغربی تہذیب بھی محض استقرائی عقل کے ظاہر تجربے اور مشاہدے میں الجھ گئی اس نے باہر کی کھڑکی سے نظارہ کرنے تک خود کو محدود کر لیا۔ شعورِ نبوت کے ذریعے جس باطن کی کھڑکی کو وہ کھلا رکھ کر حقیقت سرمدی سے جو رہنمائی اور رشتہ قائم رکھ سکتا تھا وہ اس نے بند کر دی۔ یوں مغربی تہذیب میں علم غایت اور مقصد اور تجربہ و مشاہدہ حتمی بن گئے۔ جب کہ اسلامی تہذیب میں تجربہ اور مشاہدہ علم کی منہاج تھے اور علم محض مرئی حقیقت سے غیر مرئی حقیقت سے شادکام اور سرشاری دینے والا محض ایک آلہ تھا۔ جب ذریعہ مقصد بن گیا اور مقصد نظروں سے اوجھل ہو گیا تو فکر و نظر کا وہ انتشار وجود میں آیا جو مغربی تہذیب کا خاصہ ہے مغربی تہذیب مادّہ کے دام میں الجھ کر رہ گئی ہے یہ غایت اور مقصد سے محروم ہے اسے شعورِ نبوت کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے علم، منطقِ استقرائی اور مشاہدے اور تجربے کی منہاج سے مرئیت سے غیر مرئیت کی طرف بڑھ سکے۔ اگر ایسا ہو سکا تو یورپی تہذیب اپنے چھلکے میں ہی نہیں اپنے مغز میں بھی اسلامی تہذیب سے ہم آہنگ ہو گی اور وہ اپنے روحانی افلاس سے چھٹکارہ حاصل کر کے ایک نئی منزل سے شادکام ہو گی جو انسانیت کی معراج ہے اور اسلام کی روحانی تہذیب کا مقصود و مدعا ہے۔

محمد ظہیر الدین احمد

"ذوق و شوق" ۔ ایک مطالعہ

اقبال کی نظم "ذوق و شوق" ایک ایسا حسین اور دلکش شعری پیکر ہے جس مطالعہ کے دوران یوں محسوس ہوتا ہے کہ ذہن کی رو موجوں کی طرح ایک دوسرے سے پیوست اس طرح تیزی سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے کہ درمیان میں کہیں وقوف اور قیام بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے ۔ نادر تراکیب اور استعارے، جذبات کی شدت اور فراوانی ایک ایسا تاثر اور محویت طاری کر دیتی ہے کہ معنیٰ کی گہرائی تک پہنچنے کا مرحلہ بڑا کٹھن ہو جاتا ہے ۔ ممکن ہے میرے اس تجربہ کی شہادت آپ بھی دیں ۔ ایک ایسی ہی کیفیت میں اس نظم کے بعض استعاروں اور علائم کو سمجھنے کے لیے میں نے کلام اقبال کے بعض مشہور شارحین کی مدد لی ۔ لیکن رہ رہ کر یہ سوال ذہن میں ابھرتا رہا کہ تجزیہ و تحلیل، نقد و نظر اور جمالیاتی تحسین کے وہ پیمانے جو اقبال کی شاعری کو پرکھنے اور اس کی قدر و قیمت کو آنکنے کے لیے استعمال کیے جاتے رہے ہیں، کیا وہ کافی ہیں؟ یا اقبال کی شاعری، اس کے شارح اور نقاد کے لیے کچھ اور معیارات کا تقاضا کرتی ہے ۔ بات اور بھی دشوار ہو جاتی ہے جب "حدیثِ خلوتیاں" کو سمجھنے کے لیے اس کی وجدانی سرچشموں کو نظر انداز کر دیا جائے ۔ کہیں کہیں کسی نقاد کا لہجہ نظم کے عمود تک عدم رسائی اور مختلف بندوں کے معنوی ربط کی تلاش میں عاجز رہ جانے کی وجہ سے تمسخر آمیز بھی ہو جاتا ہے ۔ ایسے موقع پر اقبال کا یہ شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے ؎

کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم
آں متاعم کہ شود دست زر بے بصراں

شاید اسی لیے اقبال کا مطالبہ ہے کہ فتوحاتِ جہانِ ذوق وشوق کے لیے جذبِ دروں کے ساتھ نگاہِ شوق بھی چاہیئے، محض خردمندی کافی نہیں۔ "سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق" کا نعرۂ مستانہ بلند کرنے والا اقبال۔ "بہ آں مقام رسیدم" کہتا ہوا باخبر کردیتا ہے کہ طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است"۔ "اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند" کہہ کر اپنے خمستان سے "یک دو ساغر کش" کی دعوت دینے والا اقبال یہ بھی جتادیتا ہے ؎

بیا کہ من زخمِ پیرِ رومِ آوردم
مئے سخن کہ جواں تر زبادۂ عنبی

اس پس منظر میں شاید کہا جاسکتا ہے کہ ذوق وشوق جیسی نظمیں نقد ونظر کے نئے منہاج کی ضرورت کا احساس دلاتی ہیں۔ اس جملۂ معترضہ کا مقصد مطالعہ اقبال اور اقبال شناسی کے سفر میں ایک طالب علم کی دشواریوں کو اقبال شناسوں کی خدمت میں پیش کردینا ہے۔

شارحین نے اس نظم کو نعتیہ قصیدہ یا سفرِ حجاز کا بدل بھی کہا ہے، لیکن بعض کلیدی تراکیب اور استعاروں کے تجزیہ اور تعبیر میں اس مرکزی خیال سے رشتہ باقی نہیں رہتا اور نظم کے محور سے اس کے مختلف بندوں کا معنوی ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے شاید نظم پر غور کرنے سے پہلے چند بنیادی باتوں کا تعین ضروری ہے، خود اس نظم کا پس منظر اور عنوان میں نظم کے عمود تک رسائی میں مدد دیتے ہیں۔

ذوق وشوق اقبال کے سفرِ فلسطین کی یادگار ہے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد موتمر عالم اسلامی کے سلسلہ میں وہ فلسطین پہنچے۔ اجلاس سے پہلے عالم اسلام کے مشاہیر اور نمائندے مسجدِ اقصیٰ میں جمع ہوئے اور یہ حسنِ اتفاق تھا کہ یہ رات جشنِ معراج کی تھی۔ مسجد اقصیٰ میں عالم اسلام کے نمائندوں کا اجتماع، جشنِ معراج اور اس موقع پر علامہ رشید رضا کی تفسیر آیاتِ معراج، عالم اسلام کے کرب و اضطراب کا جائزہ، یہ سب باتیں عندلیبِ باغِ حجاز کو تڑپانے کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہیں، اس روح پرور ماحول اور پرکیف فضا کے ساتھ ساتھ غمِ ملت، اس سارے پس منظر میں ذوق وشوق کی کیفیات اجاگر ہوتی ہیں۔

عنوان میں "ذوق و شوق" کی اصطلاح اور ترکیب سے اس تاثر اور فضا کا سراغ بھی ملتا ہے جو پوری نظم میں جاری و ساری ہے۔ ذوق عبارت ہے حضوری اور دید سے بعض عارفین نے اسے "درجات شہود وحق کا پہلا درجہ بتایا ہے"۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ "یہ ایک ایسا داخلی درک جو غیر زمانی NON TEMPORAL اور غیر مکانی NON SPATIAL سطحوں کو بے نقاب کرتا ہے"۔ شوق محبوب کی طرف پرواز اور کشش ہے۔ یہاں ایک طویل حدیث شریف کا یہ بلیغ فقرہ قابلِ غور ہے کہ "والشوق مرکبی" (یعنی شوق میری سواری ہے) وہ سواری جو طالب کو مطلوب تک اور محب کو محبوب تک پہنچا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ زبانِ رسالت مآب سے یہ دعا بھی سکھائی گئی اسئلک لذۃ النظر الی وجھک والشوق الی لقائک۔ اقبال نے بات کو یہ کہہ کر اور بڑھایا ہے

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

اقبال کے نزدیک زندگی، اسی طغیانِ شتاقی سے عبارت ہے۔

اس نظم کے پس منظر اور ذوق و شوق کی ترکیب کی معنویت کی اس روشنی میں شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ذوق و شوق اقبال کی ایک وارداتِ قلبی اور روحانی تجربہ ہے ؎

مقام ذوق و شوق است ایں
حریم سوز و ساز است ایں

یہ نظم ذوقِ حضوری اور سوز و سازِ فراق کے تناؤ کے درمیان اپنے عصر کے کئی بنیادی مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے ایسے سوالات کو اٹھاتی ہے جو ہماری عصری مذہبی فکر میں نئے جہانوں کی تلاش کا شدید احساس دلاتی ہے اور ان ہی تقاضوں کے جواب میں ہمارے ملی وجود کی معنویت کا انحصار ہے

اقبال نے نظم کا آغاز کرتے ہوئے بطور سرنامہ سعدی کا یہ شعر نقل کیا ہے

دریغ آمدم زہمہ بوستاں تہی دست رفتن سوئے دوستاں

وہ اس بوستاں سے لوٹ تو رہے ہیں، ساتھ ہی تہی دستی کا احساس دامن گیر ہے۔ لیکن ان کی یہ

وادواتِ ذوق وشوق ایک ایسا حسین شعری پیکر میں ڈھل کر دوستوں کے لیے سوغات بن گئی ہے:

نظم کا پہلا بند دشت میں صبح کے سماں کی منظر کشی سے شروع ہوتا ہے

قلب ونظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

صبح یا سحر اقبال کی ایک بڑی پسندیدہ اور بلیغ علامت ہے۔ بانگ درا کی آفتاب صبح "آفتاب"، جیسی نظموں سے لے کر ضرب کلیم کی مختصر نظم "صبح" تک کئی مقامات پر صبح کی کیفیات اور اس کے رموز وکیفیات کے اشارے ملتے ہیں۔

اقبال نے اپنے ابتدائی عہد کی نظم "آفتابِ صبح" میں کہا تھا

نور سے معمور ہو جاتا ہے دامانِ نظر
کھولتی ہے چشم ظاہر کو ضیا تیری مگر
یہاں ساتھ ہی ساتھ اس آرزو کا بھی اظہار تھا
ڈھونڈھتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشمِ باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیے

اور یہاں ذوق وشوق کا یہ پہلا شعر بتاتا ہے کہ صبح کا سماں محض ظاہر کی آنکھ کا تماشا نہیں بلکہ دیدۂ دل کا محو نظارہ ہے۔ یہ صبح کوئی ایسی صبح نہیں ہے جو ہر روز نمودار ہوتی ہے اور نہ یہ آفتاب وہ آفتاب ہے جو ہر دن طلوع ہوتا ہے، بلکہ یہ صبح وہ صبح ہے جو قلب ونظر کی زندگی ہے۔ یہ تمثیل کئی پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ مشاہدہ کے اجزاد آفاق کے مظاہر ہیں، لیکن شاعرانہ شخصیت اپنے تخلیقی اظہار میں، مشاہدہ کے ذریعہ خارج کے معروف موضوع کو معلوم الفاظ میں بیان کرتی ہے، شاعر اس کی ایسی تعبیر کرتا ہے کہ ساری فضا بدل جاتی ہے اور معنویت کے بیکراں امکانات شخصیت کے تاثر کی وجہ سے ابھرتے ہیں اور یہ مشاہدہ اس کی تخلیقی شخصیت میں منعکس ہو کر نہ صرف شاعر کی ذات کا عکاس بن جاتا ہے بلکہ قاری اور سامع کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتا ہے۔

اس طرح آفتاب کا طلوع' شاعر کے نزدیک حسنِ ازل کی نمود ہے اور اس سے رواں' نور کی ندیاں' تجلّیات اور انوار کا ظہور ہیں۔ جلوؤں کا وہ ہجوم ہے کہ نظر خیرہ ہو رہی ہے لیکن دل کسبِ فیض کر رہا ہے اور یوں" ایک نگاہ کا زیاں" " دل کے لیے ہزار سُود" بن رہا ہے۔

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اِضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہوا برگِ نخیلِ دھل کے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

یہ اشعار صاف ظاہر کرتے ہیں کہ صبح کا یہ منظر ارضِ فلسطین کا نہیں بلکہ نواحِ مدینہ کا ہے۔ نواحِ مدینہ میں حضوری کی کیفیات کے اظہار کے لیے اقبال نے عربی قصائد کی پیروی میں دیارِ حبیبؐ کے مقامات کا ذکر کیا ہے ۔ تجلی کیفیات اور سوز دروں کے اظہار کے لیے یہ شاعرانہ اسلوب ایسا دلکش ہے کہ پاسِ ادب بھی رہے اور دیارِ محبوبؐ میں حضوری کا راست ذکر بھی نہ آئے بلکہ اندازِ بیان' اور اس دیار کے مقامات اور آثار کے سہارے اپنی وارفتگی اور سوز و ساز عشق کا اظہار ہو۔ قصیدہ میں تشبیب کے معنی آگ کو بھڑکانے کے بھی ہیں' یعنی اصل مضمون کو پیش کرنے سے پہلے محبوب سے نسبت رکھنے والی باتوں اور مقامات کا ذکر کیا جائے تاکہ آتشِ شوق تیز ہو۔ بوصیری کی پیروی میں کاظمہ اور کوہِ اضم کا تذکرہ اسی ایمائی کیفیت کا آئینہ دار ہے' لیکن انداز کتنا نرالا اور دلکش ہے۔ بوصیری کے مشہور قصیدہ کا یہ شعر اس موقع پر بے جا نہ ہوگا۔

اَمْ ھَبَّتِ الرِّیْحُ مِنْ تِلْقَآءِ کَاظِمَۃٍ
وَاَوْمَضَ الْبَرْقُ فِی الظَّلْمَآءِ مِنْ اِضَمٍ

(ترجمہ) یا مگر از کاظمہ بادے وزید از کوئے دوست
یا مگر در نیم شب برقے جہیدہ از اِضم (جامی)

اقبال نے اپنے حسن کارانہ اظہار کے ساتھ کوہِ اضم اور نواحِ کاظمہ کے ساتھ جن کیفیات کا اظہار کیا ہے وہ پہلے بند کی پوری فضا سے معنوی طور پر ہم آہنگ ہیں ۔ سحابِ شب کی چھوڑی ہوئی

بدلیوں کو کوہِ اضم پر طیلساں کی تشبیہ نے اضم کو تقدس، وقار اور عظمت عطا کی ہے۔ رات کی بارش نے برگِ نخیل کو دھو دیا ہے، ساری فضا گرد سے پاک ہوگئی ہے اور کاظمہ کی ریت مثلِ پرنیاں نرم بن گئی ہے۔

اس منظر سے گزرتے ہوئے شاعر کی نظر بجھی ہوئی آگ اور خیموں کی ٹوٹی ہوئی طنابوں پر پڑتی ہے۔ ذوق و شوق کے اس سفر میں اس مقام پر کتنے کارواں آئے اور گزر گئے اور ان کے چھوڑے ہوئے آثار ان کی یاد دلاتے ہیں۔ قافلہ والوں کی چھوڑی ہوئی سلگتی لکڑیاں ان کے سوزِ دروں کی غماز بن گئی ہیں۔

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

پچھلے اشعار کا سارا پس منظر اسی مقام کو اجاگر کرتا ہے جو راہِ شوق میں سرگرمِ سفر کاروانوں کی منزل ہے۔ یہاں روح القدس کی یہ غیبی آواز اقبال کے اس مقام کی شہادت دیتی ہے

آتی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

دشت میں صبح کی نمود، چشمہ آفتاب سے رواں نور کی ندیوں کی تہہ دار معنویت، اور مقامِ حضوری کی کیفیات کے اظہار کے بعد دوسرے بند میں معاً رخِ قافلۂ حجاز کی طرف مڑتا ہے

کسی نے لکھا ہے کہ پہلے بند کی حسین شاعری کے بعد وہی بند سے ٹکے مضامین، وہی عشق کی تکرار بہت بے ربط معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دوسرے بند کا پہلا شعر ہی گرہ کشائی کرتا ہے اور اس معنوی ربط تک پہنچا دیتا ہے جو پہلے بند اور دوسرے بند میں ہے —

"تازہ ہیں میرے واردات" کہنے ہے بزمِ کائنات، یہاں واردات "تازہ" کے بعد بزمِ کائنات میں مراجعت ہے۔ عرفان و آگہی اور عالمِ انسانیت یا تاریخ اقبال کے ہاں یہ مقامات پہلو بہ پہلو ہیں۔ اس لیے وہ "اندکے اندر حرائے دلنشیں" اور اس کے بعد کی منزلوں کے بعد "جلوہ گرشو بر سرِ فارانِ عشق" کی بھی دعوت دیتے ہیں۔ "تنہائی سے انجمن" اور خلوت سے جلوت تک سفر کی جانب

بلیغ اشارے عصری مذہبی فکر میں اقبال کی بڑی دین ہیں۔

اقبال نے انسان کے ان دو ابعاد کو مصطفائی اور کبریائی کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ ایک رُخ وہ ہے جہاں وہ اپنے روحانی ربط کے ذریعہ حقیقت کے سرچشمہ سے قریب ہوتا اور دوسرا رُخ وہ ہے جہاں اس ربط کی بنیاد پر وہ اپنے زمانہ پر اثر انداز ہوکر اسے منقلب کرتا ہے۔

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

میں یہاں پروفیسر عالم خوندمیری کی یہ تحریر پیش کروں گا، جنھوں نے اپنے انداز میں فکرِ اقبال کے اس پہلو کی یوں وضاحت کی ہے "اگر صوفی عالم ابدیت کی سیر میں گم ہو جائے تو زمانی عالم اس کی نظر میں حلقۂ دام فریب بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی نجات اس دنیا سے اور زمانی نظام سے مستقل گریز میں تلاش کرتا ہے۔ لیکن ایسا صوفی جس نے نبوت سے فیض حاصل کیا ہو، وہ زمانی نظام سے گریز کی راہ اختیار نہیں کرتا بلکہ اس نظام کو ابدیت کے نور سے روشن کرنے کی کوشش کرتا ہے"۔

(بہ حوالہ اقبال اور تصوف مطبوعہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر مضمون بہ عنوان "تصوف کشمکش و گریز")

اپنے پانچویں خطبہ میں اقبال نے اس نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے کہ کسی روحانی تجربہ کی عظمت کو جانچنے کا ایک عملی معیار یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے معاشرہ پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی لیے ملت کا کرب اس کے لیے تڑپ اقبال کی شاعری میں حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض و نیاز سے مربوط نظر آتی ہے۔ اسرار خودی سے لے کر ارمغانِ حجاز تک رحمۃ للعلمینؐ کے حضور میں جو اپنی عقیدت اور محبت اور آپؐ کے فیضان اور احسانات کا تذکرہ کیا ہے وہ ملت کے لیے تڑپ کا اظہار لازمی جز بن گیا ہے اور کہیں کہیں تو بڑے ہی انوکھے انداز میں اچانک اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ میں یہاں اسرارِ خودی سے صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ تذکرہ محسنِ انسانیتؐ کی انسانوں سے غم گساری کا یوں ہو رہا ہے

در مصافے پیشِ آں گردوں سریرؐ — دخترِ سردارِ طُے آمد اسیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود — گردن از شرم و حیا خم کردہ بود

دخترک را ایں چوں بے پردہ دید   چادرِ خود پیشِ روے او کشید

اب یہاں اقبال کی یہ دلدوز آہ اچانک بلند ہوتی ہے۔

ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم

عرض کرنا یہ ہے کہ اگر اقبال کی اس نظم "ذوق و شوق" کا محور ذاتِ رسالت مآب صلعم میں حضوری ہے تو پھر ملت کے اضطراب کی طرف مراجعت یہ کہ نہ صرف بے محل نہیں ہے بلکہ ان کی پوری وجدانی شاعری کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔

یہاں اقبال یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس تاریخی گروہ کا جسے دنیا کا سب سے زیادہ آرزومند گروہ بنایا گیا تھا اپنے سرچشمہ سے ربط ٹوٹ چکا ہے۔ اسی لیے اس واردات تازہ سے مراجعت کے بعد انھیں یہ بزم کائنات کہنہ نظر آتی ہے۔

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات

عرب کا سوزِ دروں اور اس کے مشاہدات اور عجم کی فکرِ بلند اور علمی مہمات تاریخ انسانیت کا روشن باب رہے ہیں، لیکن آج یہ دونوں اپنی خصوصیات اور منصب سے بیگانہ بن گئے ہیں۔ یہاں اس سارے پس منظر میں حسین رضہ ایک علامت کے طور پر ابھرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک حقیقتِ شبیری رضہ ایک ابدی حقیقت ہے اور تاریخ کے بدلتے ہوئے اندازِ کوفی و شامی اس کی عصری معنویت کی تلاش ضروری ہے۔ اس اسوہ میں عشق کا سوز و ساز بھی ہے اور زمانہ سے ستیز و ساز بھی۔ کیا آج ہمارے عصر میں عالمِ اسلام کی اضطراری کروٹیں اس بات کی گواہی نہیں دے رہی ہیں کہ عشق کی روح سے عاری ہو کر شرع و دین بھی تصورات کا بتکدہ بن گئی ہیں اور شاید قافلۂ حجاز کی افسردگی کا علاج اقبال اس نوا میں ہے۔

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسین رضہ باز دہ کوفہ و شام خویش را

غیر بتِ عشق کسی اور کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دے سکتی۔ لذتِ آشنائی دو عالم سے دل کو بیگانہ کر دیتی ہے۔ شعلۂ نمرود میں تپ کر صدقِ خلیلؑ کندن بنتا ہے اور میدانِ کربلا میں عشقِ غیور اپنے خون میں نہا کر سرخ رو ہے۔ گویا ملت کے مرکز محسوس اور وحدت کی بنیاد عشق پر استوار ہے۔ اور اس کی آبیاری خونِ حسینؓ سے ہے۔ کعبہ سے کربلا تک اس سفر میں کتنی معنویت پنہاں ہے۔ صدقِ خلیلؑ اور صبرِ حسینؓ کے ساتھ بدر و حنین کا اس شعر میں تذکرہ اس حقیقت کی بھی یاد دلاتا ہے کہ عشق محض حرا کی تنہائی سے عبارت نہیں بلکہ بدر و حنین کی معرکہ آرائی کا بھی نام ہے۔

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اسی لیے تیسرے بند میں اقبال نے ذاتِ رسالت مآبؐ سے اس ٹوٹے ہوئے ربط کو دوبارہ استوار کرنے کی بات کہی ہے۔ "تیسرے بند کے آغاز میں اقبال نے ذاتِ ختمی مرتبتؐ کے لیے "آیۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب" کا نادر استعارہ برتا ہے۔ اس استعارہ کی تعبیر میں ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ انسان ہی آیۂ کائنات کا اصل معنیٰ ہے جس کی تلاش میں رنگ و بو کے قافلے سرگرداں ہیں، یا یہ کہ اس سے مراد، مردِ مومن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان خلاصۂ کائنات ہے اور تخلیق و ارتقاء کی آخری منزل۔ لیکن آیۂ کائنات میں کوئی معنیٰ نہیں پیدا ہوتے جب تک کہ مظہرِ اولاک نہ ہو۔ تصورِ خلافت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ تمام کمالات ایک ایسی ہستی پر ختم ہوں جو تمام اسماء و صفات کی مظہرِ اتم ہو۔ ساری کائنات کا خلاصہ بے شک انسان ہے لیکن عالمِ انسانیت کی تربیت انبیائے کرامؑ کے ذریعہ ہوتی رہی اور اقبال کے نزدیک مختلف انبیاء کا ظہور دراصل مدارجِ محمدیہؐ کا تدریجی ظہور ہے۔ صاحبِ گلشن راز نے بڑی خوبی سے یوں اس رمز کو سمجھایا ہے:

نبوت را ظہور از آدم آمد　　کمالش در وجودِ خاتم آمد

اس بند کے پہلے شعر سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ ذاتِ ختمی مرتبتؐ ہی عالمِ انسانیت کا "معنیٔ دیر یاب" اور "مقام و منزل ہر راہرو" ہے اور "تلاشِ مصطفیٰؐ" اس کا سفر۔ تلاشِ مصطفیٰؐ محض ایک سکونی عمل نہیں بلکہ مسلسل حرکت ہے۔ اس بند کے دوسرے ہی شعر میں اقبال کی یہ فریاد بھی ہے:

خلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
جلوتیاں میکدہ کم طلب و تہی کدو

یعنی زندگی کی خارجی اور باطنی پہلوؤں میں رہبری کرنے والے دونوں گروہ حرکت و بصیرت سے عاری ہیں۔ ایک کی ذمہ داری خارجی پیکر کی برقراری اور تحفظ سے ہے اور دوسرے کا تعلق باطن کی شادابی اور خلاقی سے ہے۔ لیکن جزئیات اور فروعات پر غیر متوازن اصرار نے قافلۂ حیات کو سعادت کی راہ سے ہٹا دیا ہے۔ نہ تو مکتبوں میں رعنائی افکار ہے اور نہ خانقاہوں میں لذتِ اسرار۔

اٹھائیں مدرسے و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس پس منظر میں اقبال کی نوا کا مقصود، اسی آتش رفتہ کا سراغ ہے جس کے وجود سے تب و تاب زندگی اور حرکت و حرارت قایم تھی۔

میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

کھوئے ہوؤں کی جستجو، بے روح احیاء پسندی اور ماضی پرستی نہیں بلکہ ان ابدی اقدار کی بازیافت ہے جن پر انسانیت کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ ماضی کے تجربات سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اسے حال کا جز بنانا ہے اور ایک نئے جہان کی تعمیر کا حوصلہ اسی سوز و سازِ آرزو سے ملتا ہے، جس کی نشو و نما شاعر کی موجِ نفس سے ہوتی ہے۔ اقبال نے ایک مقام پر کہا تھا

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے

یہاں خود اقبال کا اپنا عرفان بھی ہے، جو اپنے عصر کے تقاضوں میں ایک ایسی علامت کے طور پر ابھرتا ہے جس کی تلاش و جستجو اسی سرچشمۂ فیض کی اپنے عصر میں بازیافت ہے جس کا مقصد اپنی نوا سے زمانہ کے خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکانا ہے۔ اس نوا کی پرورش خونِ جگر سے ہے۔ درد و سوز کے لیے شگاف سینہ یعنی دردِ عشق بھی ضروری ہے۔ نَے سے نکلتی ہوئی صدائے درد محض

سوا کا زیر و بم نہیں ہے بلکہ اس میں نے نواز کا تپشِ عشق بھی شامل ہے۔ اس لیے اقبال کی آرزو سکون کی نہیں بلکہ تڑپ میں اضافہ کی ہے کہ اسی بے قراری اور سوز و ساز سے زندگی عبارت ہے۔

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

چوتھے بند کے آغاز میں لوح، قلم اور الکتاب، ایک ہی حقیقت کے ظہور کے مدارج ہیں جن میں ایک کلّی وحدت ہے۔ یہاں بھی اشارہ اس ذاتِ گرامی کی طرف ہے جو نگاہِ عشق و مستی میں اوّل بھی ہے اور آخر بھی۔ آپ کا وجود ہی وجہِ تخلیق کائنات ہے اور اس وجودِ بسیط کے آگے یہ گنبدِ آبگینہ رنگِ حباب سے بڑھ کر نہیں۔ آپ کے ظہور کا مقصد، ایک ابدی، روحانی اساس پر عالمِ انسانیت کی وحدت کی تشکیل بھی ہے اور اس کی حرکت کی برقراری بھی۔ آپ ہی کی نگاہِ کیمیا اثر نے ذرّوں کو سنوارا اور انھیں آفتاب بنا دیا۔

آگے کے تین اشعار میں اقبال نے ذاتِ ختم الرسل کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کیا ہے جو بظاہر ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں لیکن دراصل یہ ایک ہی اکائی کے دو لازمی اور تکمیلی اجزا ہیں۔ جلال اور جمال، قیام اور سجدہ، عقل و عشق یہ تمام ایک ہی کُل کے دو رُخ ہیں اور ان ہی پہلوؤں کے باہمی ربط اور امتزاج سے انسانی وجود کی مکمل تصویر بنتی ہے۔ یہ ذاتِ رسالت مآب کا فیضان ہے کہ زندگی کا ہر پہلو اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ قہاری و غفاری، قدوسی وجبروت، کے بظاہر متضاد عناصر ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی لیے اقبال کہتے ہیں کہ شوکتِ سنجر و سلیم آپ کی شانِ جلالی کا ایک رُخ ہیں اور جنید و بایزید بھی آپ کی شانِ جمالی کی جھلکیاں ہیں۔

قیام اور سجدہ کے استعارے بھی اقبال کے ہاں معنویت سے بھرپور ہیں، قیام میں جلالِ کبریائی ہے اور سجدہ جمالِ بندگی سے عبارت ہے اور یہ دونوں پہلو ذاتِ مصطفےٰ سے ہی وابستہ ہیں ہمہ

فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است
ایں تجلی ہائے ذات مصطفیٰ است

ایں دو قوت از وجودِ مومن است
ایں قیام و آں سجودِ مومن است

نماز بہ حیثیت کُل ان دو پہلوؤں سے عبارت ہے جو ہمارے پورے ذہنی رویہ کو متعین کرتی ہے اور جسے معراجِ مومن بھی کہا گیا ہے اور اگر صاحبِ معراجؐ کی محبت جادۂ ذوق و شوق کے مسافر کی رہنما بن جائے تو یہی ولولۂ شوق اسے لذتِ پرواز عطا کرتا ہے۔ اس کے بغیر اقبال کے نزدیک قیام اور سجدہ دونوں حجاب بن کر محض ایک رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس بند میں اقبال عقل اور عشق کے دونوں پہلوؤں کا بھی جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ دونوں آپؐ کی نگاہِ ناز سے مراد پا گئے۔ تلاش اور جستجو عقل کا نصیب ہے اور سوز و سرور و اضطراب سے عبارت ہے۔ عام طور پر غیر متوازن انداز میں یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ اقبال عقل کے مخالف ہیں۔ لیکن یہ شعر اس نقطۂ نظر کی نفی کرتا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عقل کی تقدیر میں حضور نہیں، لیکن اس کا اپنا منصب بھی ہے جس کی تکمیل عشق سے ہوتی ہے۔ خطبات میں اقبال نے اسلام میں عقلِ استقرائی کی اہمیت کو ختمِ نبوت کا ایک فیضان قرار دیا ہے۔

اس بند کی ابتدا ذاتِ وجہِ تخلیقِ کائنات کے لیے لوح، قلم اور الکتاب کے استعاروں سے ہوئی تھی، جو ایک کُلّی حقیقت کا اظہار ہیں جیسے میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ اس بند میں اقبال نے جن مختلف اقطاب کو برتا ہے، جو ایک ہی اکائی کے تکمیلی اجزاء ہیں جو ذاتِ ختمی مرتبتؐ کے فیضان سے اپنے کمال کو پہنچتے ہیں۔ یہاں اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ آج کے عصر کا المیہ یہ ہے کہ زندگی کا ہر ادھورا پہلو اپنے مکمل ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور ہر جُز اپنے دیگر تکمیلی اجزاء سے الگ ہو کر انسانی رویّہ پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس لیے اس بند میں اقبال کی التجا یہی ہے کہ گردشِ آفتاب سے دل کی دنیا روشن نہیں ہو سکتی۔ اس آفتاب سے زندگی کا ایک رُخ منوّر ہوتا بھی ہے تو دوسرا رُخ تاریکی میں رہتا ہے۔ اس خارج و باطن دونوں کے نکھار اور شادابی کے لیے آپؐ ہی کے جلوہ کی تنویر چاہیئے تاکہ زمانہ ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہو۔ مشرق کا رجحان انفس کی سیر رہا اور مغرب خارج میں کھو گیا۔ اقبال انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں

کے درمیان کمالِ توازن اور وحدت کی کارفرمائی چاہتے ہیں جس کی معراج انھیں ذات رسالت مآبؐ میں ملتی ہے۔

آخری بند کے آغاز میں اقبال یہ عرض کرتے ہیں کہ طلب و جستجو میں ایک عمر بسر کرنے کے بعد مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ علم شجر بے ثمر ہے اور عشق ہی اصل حیات ہے۔ یہاں علم یعنی محض مجرد عقل منزل آشنا نہیں کر سکتی لیکن اگر زمام کار عشق کے ہاتھ میں ہو تو قافلۂ حیات اپنے وجود کی تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ اس دور میں بھی عقل اور عشق کا یہ معرکہ تازہ ہے۔ اقبال کے نزدیک کاروانِ شوق کی منزل عشقِ مصطفےٰؐ ہے اور اس منزل تک علم رسائی بولہبی ہے۔

بہ مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

اس عشق کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ کوئی تو منزل کی جستجو میں عمر بیں گزار دیتا ہے اور کبھی یہ حال ہوتا ہے کہ ؎ "طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے" دوسرے بند میں بھی اقبال نے عشق کی اہمیت پر زور دیا، لیکن وہاں اس کی سمت عالم تاریخ ہے اور یہاں اس جہت ہے، عارفانہ ہے۔

اب یہاں نظم کا اہم ترین پہلو "فراق" اجاگر ہوتا ہے۔ عالم سوز و ساز میں وصل کی نہیں فراق کی اہمیت ہے۔ فراق ہی تکوین اور تکمیل کا سبب ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی خودی کا استحکام فراق کی بدولت ہے اور فراق عشق کا آئینہ دار ہے۔

جدائی خاک را بخشد نگاہے
دہد سرمایۂ کوہے بہ کاہے
جدائی عشق را آئینہ دار است
جدائی عاشقاں را سازگار است

فراق کے اس پہلو کی عارفانہ جہت کو اقبال نے گلشنِ راز جدید اور زبور عجم کے کئی اشعار میں پیش کیا ہے اقبال کا کہنا ہے کہ فراق کی بدولت فنا، بقا سے ہمدوش ہوتی ہے۔

چہ خوش سودا کہ نالد از فراقش
ولیکن ھم ببالد از فراقش
خودی را تنگ در آغوش کردن
فنا را بقا ہم دوش کردن

اس بات کو سمجھنے میں شاید ڈاکٹر عابد حسین کی اس وضاحت سے مدد مل سکتی ہے۔

"عشق کی تین منزلیں ہوتی ہیں، آرزو یا جستجو۔ دید۔ اور وصل قدیم شعرا کے یہاں اس تیسری منزل کا مقصود یہ ہے کہ طالب، مطلوب کے اندر اس طرح فنا ہو جائے جیسا قطرہ دریا میں محو ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ محدود اور محدود کے وصل کا اس کے سوا کوئی تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر اقبال کے نزدیک عشق کی صرف دو ہی منزلیں ہیں۔ پہلی منزل سوز و گداز کی ہے اور دوسری کیفیت دیدار کی جو راحت بخش بھی ہے اور اضطراب افزا بھی۔ تیسری کوئی منزل نہیں۔ یہاں لذت دیدار سے کامیاب ہونے کے بعد نفسِ انسانی روح مطلق سے جدا رہتا ہے اور دردِ جدائی سے تڑپتا ہے۔ یہی اس کی فطرت اور یہی اس کی تقدیر۔ (بہ حوالہ مجلّہ اُردو اقبال نمبر ۱۹۳۸ء)

میں مزید تفصیل کے لیے پروفیسر عالم خوندمیری کے یہ دو جملے پیش کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے عالمانہ انداز میں اس پہلو کو یوں پیش کیا ہے، "اقبال کو ابد اور زمانہ کے تناؤ کی برقراری ہی میں انسانی شخصیت کی تکمیل کے امکانات نظر آتے ہیں۔ اس لیے وہ ایک ایسے مردِ مومن کا جویا ہے جو لمحۂ وصال سے لمحاتِ فراق کی جانب واپس آنے کی طاقت رکھتا ہے جس میں تخلیق کے امکانات پوشیدہ ہیں۔"

فراق اقبال کا اتنا محبوب موضوع رہا ہے کہ انھوں نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا کہ انھیں "سرّالوصال" کے بجائے "سرّالفراق" کہا جائے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج بعض ناقدین اقبال کے نفسیاتی تجزیہ کے ضمن میں تہذیبی اور سیاسی سطح پر فراق کی کارفرمائی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب "ذوق و شوق" کا سلسلہ منزل تک پہنچ رہا ہے۔ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا یہ نظم ذوقِ حضوری اور فراق کے تناؤ کے درمیان آگے بڑھتی ہے۔ اس کشمکش کا اظہار اقبال یوں کرتے ہیں

عینِ وصال میں بھی، مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جُو رہی، میری نگاہ بے ادب

سوز و سازِ آرزو، لذتِ وصال سے زیادہ عزیز ہے۔ اسی لیے اقبال فراق کے اس مقام کے رمز شناس بن جاتے ہیں کہ اس میں لذتِ طلب ہے مسلسل سفر۔

گرمیٔ آرزو فراق، شورش ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

غرض اس حسین اور دلکش شاہکار نظم میں ایک طرف تو اقبال کے داخلی تجربہ کی ساری نزاکتوں اور جذب و سرور کا رچاؤ ہے تو دوسری طرف اس کی جلو میں غمِ انسان اور غمِ ملّت کے تقاضے میں جو اُن کی تخلیقی شخصیت کا ایک اہم جذبہ ہیں۔ وہ ان دونوں پہلوؤں کا ایک ایسی سطح سے اظہار کرتے ہیں، جہاں ان کو الگ الگ دیکھنا یا دکھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کا سارا حُسن اس نظم کی معنوی وحدت میں سمٹ کر نمایاں ہو گیا ہے۔ اس طرح "ذوق و شوق" ایک مکمل شعری کارنامہ، مربوط آہنگ اور جذبہ و فکر کے توازن کی انوکھی مثال بن گئی ہے۔ کرب و اضطراب کے لمحاتی تاثر کو فکر کے شاداب اظہار کی خلاقی نے بیکراں بنا دیا ہے۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب اس نظم کی ترکیب اپنی موضوعاتی پیچیدگی کے باوصف اقبال کی پوری معنوی شخصیت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، جہاں شاعری اور عرفان کی روح اثر آفریں اظہار کے قالب میں، انسانی تجربہ کی طرح نہ صرف ہم سے ہم کلام ہو جاتی ہے بلکہ اپنے تجربہ کے انمٹ نقش بھی مرتسم کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل
شعبۂ اردو جامعہ کراچی

اقبال کے دو غیر مدون خط

اقبال کے نادر و غیر مطبوعہ اور غیر مدون خطوط کی تلاش و تحقیق اور دستیابی ایک عرصہ سے اقبالیات کے متعدد نئے گوشے وا کر رہی ہے۔ پھر مکاتیبِ اقبال کی ترتیب و تدوین کی حالیہ کوششیں بھی عہدِ جدید کے تقاضوں کے مطابق اقبالیات کے معیار اور اس کے متعلقہ موضوعات کو، ان کے بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت میں قابلِ استعمال بنانے کے لیے معاون ثابت ہوئی ہیں۔

ذیل میں اقبال کے دو غیر مدون خطوط کے اقتباس نقل کیے جا رہے ہیں، جو اقبال نے سجاد مرزا بیگ دہلوی کے نام تحریر کیے تھے۔ یہ خطوط اب مکمل تو دستیاب نہیں، لیکن اُن کا نفسِ مضمون چونکہ شائع ہو گیا تھا، اس لیے بس یہی دستیاب مطبوعہ متن اقبال کے گمشدہ آثار کی بازیافت کے طور پر اقبالیات کے ذیل میں ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے مکتوب الیہ محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں انجمن ترقی اردو کی زیرِ ہدایت مرتبہ اُردو مطبوعات کی اولین ضخیم فہرست "الفہرست" کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

محمد سجاد مرزا بیگ ۱۸۷۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اسلاف میں اہلِ سیف اور اہلِ قلم دونوں طرح کے بزرگ شامل تھے اور ۱۸۵۷ء سے قبل قلعۂ معلیٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن انقلابِ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے والد محمد مرزا بیگ نے انگریزی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد سجاد مرزا بیگ تلاشِ روزگار میں دہلی سے حیدرآباد دکن منتقل ہو گئے، جہاں ۱۹۱۵ء میں "نظام کالج" میں اردو کے استاد کی حیثیت میں ان کا تقرر ہو گیا۔[1]

---

[1] سجاد مرزا بیگ "تسہیل البلاغت" (حیدرآباد دکن) ۱۳۳۹ھ ص ۱۰

اپنے اساتذہ کے زمرے میں سجاد مرزا بیگ نے حافظ اخوند محمد عمر[۲] اور نواب بشیر الدین احمد خاں[۳] کے نام تحریر کیے ہیں[۴]۔ اور احباب میں متعدد اہم نام نظر آتے ہیں۔ مثلاً مولوی سید احمد دہلوی (مرتب "فرہنگِ آصفیہ"[۵]) اور مولانا محمد علی جوہر۔ علی برادران نے جب حرمت و حفاظتِ حرمین شریفین کے لیے "انجمن خدام کعبہ" قائم کی تو سجاد مرزا بیگ حیدر آباد میں اس کے قیام و فروغ کے لیے کوشاں ہوئے۔ ان کی تصنیف "شمع راہ" میں، جو ان کے خطبات کا مجموعہ ہے، اولین خطبہ ان کے اسی تعلق و جذبہ کا مظہر ہے[۶]۔ اداروں میں وہ "نظام کالج" کے علاوہ "جامعہ عثمانیہ" اور "انجمن ترقی اردو" کے رکن رہے ہیں[۷]۔

---

۲ مولانا فرید الدین شہید فرنگ کے فرزند۔ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء) کو انتقال کیا۔ دہلی کی مقتدر ہستی سمجھے جاتے تھے۔ سلسلۂ قادریہ سے بیعت تھے۔ ان کی ایک تصنیف "الاستشفاع والتوسیل" مشہور ہے۔ تفصیلات کے لیے: امداد صابری "دہلی کی یادگار ہستیاں" (دہلی ۱۹۷۲ء) ص ۳۳۲ - ۳۳۵

۳ دہلی میں تراہہ بہرام خاں میں رہتے تھے۔ جنوری ۱۹۱۷ء تک حیات تھے۔ "انجمن خدام کعبہ" سے منسلک اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے خاندانی ارادت مند تھے۔
"نقوش" (لاہور)، خطوط نمبر، جلد دوم ۱۹۶۸ء ص ۲۱۰ — ۲۱۱

۴ سجاد مرزا بیگ "شمع راہ" (دہلی ۱۹۳۶ء) ص ۶۳ - جنھوں نے ان کے ایک خطبہ پر، جو ذکر میلاد النبیؐ پر مبنی تھا، اصلاح بھی دی تھی۔
مشمولہ: ایضاً ص ۶۱ — ۱۰۵

۵ ایضاً ص ۱۰۹ - ۱۱۳

۶ ایضاً ص ۱۴ — ۳۵

۷ بحوالہ ایضاً، سرورق

ان کی علمی و تصنیفی خدمات کے صلہ میں نظام حیدرآباد نے ۱۹۱۸ء میں انھیں دوسو روپے ماہوار وظیفہ منظور کیا[۸]۔ پھر اپنی تصانیف "تسہیل البلاغت" "استدلال" اور "الفہرست" چونکہ انھوں نے نظام حیدرآباد کے نام سے معنون کی تھیں اس لیے نظام نے ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں انتساب کی اجازت دیتے ہوئے ان کتابوں کی اشاعت کی مد میں ڈھائی ہزار روپے انھیں عنایت کیے اور مزید پانچ سال تک دوسو روپے ماہانہ وظیفہ ان کے نام جاری کردیا۔ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں اس وظیفہ کو اضافہ کے ساتھ تاحیات کردیا گیا[۹]۔ ان اعزازات اور اپنی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں اکابر کی ستائش کے علاوہ سجاد مرزا بیگ حیدرآباد میں ہجو اور تنقید کا نشانہ بھی بنے۔ صدق جائسی[۱۰] نے اپنی خودنوشت یادداشتوں "دربار دربار" میں ان پر تحریر کردہ اپنی ایک منظوم ہجو نقل کی ہے اور اس کا پس منظر بھی بیان کیا ہے[۱۱]۔

ان کی کئی تصانیف اپنے موضوعات پر اردو میں نصابی کتب کی عدم موجودگی یا کم یابی کے سبب چونکہ طلبہ کی نصابی ضرورتوں کی تکمیل بھی کرتی تھیں، اس لیے نصاب میں بھی شامل کی گئیں۔ مثلاً "حکمت عملی" ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ کے نصاب کے لیے منظور کی گئی[۱۲]۔ ان کی

---

[۸] "تسہیل البلاغت" ص ۱۰

[۹] سید منظر علی "حیدرآباد کی علمی فیاضیاں" (حیدرآباد، ۱۳۵۵ھ) ص ۱۳۹

[۱۰] سید تصدق حسین نام صدق تخلص۔ جائس میں پیدا ہوئے اور جوانی میں حیدرآباد چلے آئے۔ تعلقات سے منسلک تھے۔ ۱۹۶۸ء میں انتقال کیا۔ شعر خوب کہتے تھے اور اسی وصف کی بنا پر شہزادہ معظم جاہ بہادر کے دربار سے وابستہ ہوئے جہاں فانی اور جوش وغیرہ سے قرب رہا۔ ان کی خودنوشت "دربار دربار" مذکورہ دربار سے ان کی وابستگی اور اس کے مختلف دلچسپ واقعات کو پیش کرتی ہے۔ یہ تصنیف حیدرآباد دکن سے ۱۹۶۱ء میں اور کراچی سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔

[۱۱] ص ۱۹۹ سے ۲۰۹ [۱۲] سید منظر علی "حیدرآباد کی علمی فیاضیاں" ص ۱۴۱

تصانیف میں "الفہرست" "تسہیل البلاغت" "استدلال" "شمع راہ" اور "حکمت عملی" کے علاوہ "تمنائے دید" "الانسان" اور "شمع ہدایت" کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان تصانیف کی صراحت موضوعات کے لحاظ سے درج ذیل ہے:

۱. "تمنائے دید": اس میں قصہ کے پیرایہ میں زندگی کے نشیب و فراز اور اخلاق و معاشرت کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ اسے "مخزنِ ادب" (دہلی) نے شائع کیا تھا۔ ان کے فرزند صفوۃ اللہ بیگ صوفی نے اپنی مرتبہ "مفصل فہرست تصانیف پروفیسر سجاد مرزا بیگ" میں اسے پروفیسر صاحب کی اوائلِ عمر کی تصنیف بتایا ہے"۔[۱۳]

۲. "حکمتِ عملی": پہلی مرتبہ "قاسم پریس" حیدرآباد دکن سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ فلسفہ عمل، قومی ترقی اور حصول عزت کے موضوعات پر مبنی اور ایک مقدمہ اور تین مقالات پر مشتمل ہے۔

۳. "الانسان": یہ علم اخلاق، مذہب، معاشرت و تمدن کے فلسفہ اور انسان کے قوائے جسمانی و نفسانی اور خصوصیات و مزاج کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ "مکتبۂ اختر دکن" حیدرآباد سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی۔

۴. "الاستدلال": یہ علم منطق پر ہے اور اس میں اس کے مسائل و مباحث کو سلیس زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے "نظام دکن پریس" حیدرآباد نے ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں شائع کیا تھا۔

۵. "الفہرست": مولوی عبدالحق کی فرمائش پر انجمن ترقی اردو کے ایک منصوبہ کے تحت یہ ایک ضخیم کتابیات مرتب کی گئی تھی جو مختلف موضوعات اور علم و فنون پر اردو میں شائع ہونے والی مطبوعات کی فہرست ہے۔ یہ "نظام دکن" پریس

---

۱۳ ص ۴۹

حیدرآباد سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ تسہیل البلاغت: حیدرآباد دکن سے ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ دراصل "نظام دکن" میں دوران تدریس علم بلاغت کی تحصیل میں مدد دینے کے لیے دیے جانے والے خطبات کا مجموعہ ہے، جو علم معانی، بیان، بدیع اور بلاغت کے تقریباً تمام اہم موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

۷۔ "شمع راہ": مختلف مجالس میں مختلف موضوعات پر دیے جانے والے خطبات کا مجموعہ ہے۔ جسے ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند صفوۃ اللہ بیگ صوفی نے دفتر کتابت "سجاد منزل" دہلی سے ۱۹۳۶ء شائع کیا تھا[14]

سجاد مرزا بیگ نے ۲ر فبروری ۱۹۲۷ء کو بعارضۂ فالج حیدرآباد میں انتقال کیا۔ ان کی وفات بعد ان کے فرزند صفوۃ اللہ بیگ صوفی نے "مفصل فہرست تصانیف پروفیسر سجاد مرزا بیگ" شائع کرتے ہوئے[15] اس کے آخر میں اپنے والد کے مکاتیب اور مضامین بھی شائع کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن راقم کو ان کی اشاعت کا علم نہیں۔ یہ "مفصل فہرست تصانیف..." جو وضاحتی ہونے کے سبب ۲۰ × ۲۶ ÷ ۱۶ سائز کے ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں جہاں تصانیف کے موضوعات اور مطالب کا مفصل اندراج ہے، وہیں آغاز میں ان کی تصانیف "حکمت عملی"، "الانسان" "تسہیل البلاغت" پر اس وقت کے اکابر علم و ادب کی آرا بطورِ تقاریظ جمع کی گئی ہیں۔ ان اکابر کے نام یہ ہیں: شبلی، حالی، مولوی ذکاء اللہ، علامہ اقبال، عزیز مرزا، ہمایوں مرزا، کپتان نواب ممتاز یار الدولہ بہادر، مولوی محمد محسن فاروقی، ڈاکٹر سید سراج الحسن، عماد الملک سید حسین بلگرامی، پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن، مولوی سید احمد دہلوی اور ڈاکٹر محمد یذل الرحمٰن۔

---

[14] "مصنفین اردو" (مطبوعہ: دہلی، ۱۹۳۹ء) کے مرتب سید زوار حسین نے ان کی ایک کتاب "شمع ہدایت" کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اس کا ذکر اور تفصیلات کہیں اور دستیاب نہیں۔

[15] مطبوعہ: سجاد منزل۔ دہلی۔ سنہ اشاعت موجود نہیں۔

ان اکابر میں سے بالخصوص شبلی، حالی اور اقبال کی غیر مدون تحریریں ان کی مختلف النوع نگارشات کے مجموعوں یا دیگر صورتوں میں منظرِ عام پر آتی رہی ہیں۔ شبلی نے "حکمتِ عملی" کے بارے میں جو رائے دی ہے[16] وہ ان کے اس طرح کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔ اور اسی طرح اقبال نے "حکمتِ عملی" اور "الانسان" کے بارے میں مصنف کو جو خط لکھے تھے وہ بھی ان کے ایسے کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔ اقبال نے اپنی یہ آراء سجاد مرزا بیگ کے نام دو مختلف خطوط میں دی ہوں گی۔ ان خطوط کے تحریر کیے جانے تاریخوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خطوط متعلقہ کتابوں کی اشاعت علی الترتیب ۱۹۰۶ء اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۷ء میں سجاد مرزا بیگ کے انتقال تک، کسی وقت لکھے گئے ہیں۔

اقبال کے ان خطوط کے اقتباس، جو مذکورہ "فہرست..." میں اسی طرح درج ہیں۔ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

(۱)

"حکمتِ عملی"

"میں نے آپ کی تصنیف "حکمت عملی" کو شروع سے آخر تک پڑھا، نہایت عمدہ اور دلچسپ کتاب ہے۔ خصوصاً عورتوں کی تعلیم کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا، نہایت مناسب اور اسلامی اصولِ تمدن کے عین مطابق ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ شاید اردو زبان میں اس قسم کی ایسی عمدہ اور حکمت آموز کتاب شاید کوئی نہ ہوگی۔"[17]

(۲)

الانسان

"میں نے آپ کی کتاب "الانسان" کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ میں اس کتاب کو اردو زبان کے علمی لٹریچر میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ سمجھتا ہوں۔ اس سے پہلے "حکمتِ عملی" لکھ کر آپ نے

---

[16] ص ۵ [17] ص ۹

اردو خواں لوگوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ "الانسان" علمی اعتبار سے بہت زیادہ وقعت رکھتی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ علمی حلقوں میں اس کتاب کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اردو زبان میں اس مضمون پر شاید کوئی کتاب موجود نہیں۔ اس اعتبار سے کہ آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ نے اس میدان میں سب سے پہلے قدم رکھا۔ اصطلاحات جو آپ نے وضع کی ہیں، نہایت عمدہ ہیں۔ طرز تحریر دلکش ہے اور دقیق مسائل کو سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی قوت جو قدرت نے آپ کو عطا کی ہے، قابلِ داد ہے۔ کاش اردو خواں لوگوں میں علمی مذاق پیدا ہو اور بہت سے ایسے مصنفین پیدا ہوں جن کے دماغی مسائل (مساعی؟) سے اردو زبان کا علمی لٹریچر ایسا ہی وسیع ہو جائے، جیسے دنیا کی دیگر مہذب زبانوں کا ہے"۔ [۱۸]

۵۵

---

[۱۸] ایضاً ص ۱۵

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہ صبحگاہی میں ہے

★

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

★

بشیر النساء بیگم بشیر

اقبال اور ہم

۱۔ ہم اقبال کی نظر میں
۲۔ اقبال ہماری نظر میں

اس مضمون کے عنوان میں "ہم" سے مراد خواتین ہیں۔ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر حیدرآباد کی ایک صاحب نظر اور حساس قلب رکھنے والی شاعرہ تھیں۔ اُن کے کلام کا مجموعہ "آبگینۂ شعر" کے نام شایع ہوا۔ وہ اقبال کی پرستار تھیں اور انھوں نے اقبال پر نہایت متاثر کن نظمیں لکھیں۔ اُن کا یہ مضمون اُن کے شوہر محترم جناب ضامن علی غازی نے عنایت فرمایا تھا ۔ موصوف اقبال اکیڈیمی کے رکن تاسیسی تھے اور انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کی یاد میں اقبالیات پر کئی کتابیں اور رسائل اقبال اکیڈیمی کے کتب خانہ کے لیے مرحمت فرمائیں۔ (ادارہ)۔

(۱)

اقبال علیہ رحمہ۔ کو صرف ایک شاعر اور اُن کے کلام کو محض شاعری سمجھنا میرے نزدیک خطرناک غلطی ہے! اگرچہ ایک حقیقی شاعر اپنی قوم کے لیے عطیۂ قدرت سمجھا جاتا ہے، لیکن آج کل لفظِ شاعر کے ساتھ ہی جو مفہوم شاعر کی ذات سے متعلق پیدا ہو جاتا ہے، ایسے ہی کسی خیال کو علامہ اقبال سے منسوب کرنا، ان کی توہین کے مترادف ہے!

وہ قدرت کی جانب سے بنی نوع انسان کے لیے ابرِ رحمت بن کر اُفقِ ہند پر نمودار ہوئے۔ اُن کے مقدس آنسوؤں نے نہ صرف سرزمینِ ہند کو سیراب کیا بلکہ ان کی حیات آفریں نواؤں نے عالمِ انسانیت کو پیامِ زندگی سنایا۔ اُن کا سوزِ یقین بے شمار سینوں میں جگمگا اُٹھا۔ اُن کا تقدس، ان کا فقرِ غیور، ان کی خود دار آہوں کا تاثر، اور یہی سب کچھ مختلف تصورات

میں کیف سرمدی، حیاتِ ابدی کے نورانی سانچوں میں ڈھل ڈھل کر آج سارے عالم میں بیداری کے آثار اور دلوں میں ایک کبھی نہ مٹنے والی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔

اقبال نے شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا بلکہ اپنے قلبی واردات کی ترجمانی کا منصب عطا کر کے اس کو حیاتِ جاوداں بخشی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اقبال نے خدا کے پیام اور انسانیت کے دستورالعمل کو پیمبرانہ انداز میں شاعری کے ذریعہ عام کیا۔ کیا ایک ایسی مقدس ترین ہستی، اور ایک ایسے الہامی پیشوا سے جس کی قلندرانہ شان، دنیا کے کسی اقتدار اور کسی منفعت سے زندگی بھر مرعوب نہ ہو سکی، یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات کو بدلتا رہے؟ اور وہ صاحبِ دل مجاہد جس کا نظریہ ہمیشہ یہ رہا ہو کہ 'زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز'! تو کیا تہذیب و تمدن کی کشاکش اور عارضی نام و نمود کی خاطر وہ حقیقتِ صداقت سے انحراف، اور عظمتِ گفتار کو نظر انداز کر سکتا ہے؟ یہی سبب ہے کہ اقبالیات میں ہمارا وہ مقام ہے جس کو عصرِ حاضر کی شوخ نظری، عیش پسندی اور باطل پرستی اپنی منزل سمجھ کر اس کے خیر مقدم کے لیے فی الوقت آمادہ اور مستعد نظر نہیں آتی اور یہی باعث ہے کہ طبقۂ نسواں میں ان کے پیام کو ابھی تک اتنی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جتنی کہ ہونا چاہیے تھی۔ لیکن ایک نہ ایک دن ہم کو اس حقیقت پر ایمان لانا ہی پڑے گا کہ اقبال نے ہمیں وہی پیام دیا ہے جو انھیں دینا چاہیے تھا۔

یہ خیال سراسر غلط ہے کہ اقبال طبقۂ نسواں کے بارے میں بڑے ہی قدامت پسند تھے۔ اور انھوں نے عورت کو ایک خادمہ کی حیثیت سے گھٹ گھٹ کر مرنے کی ہدایت کی ہے، میرے نزدیک سوائے پیغمبرِ آخر الزماں (روحی فداہ) کے دنیا کے کسی پیغمبر، کسی حکیم، کسی محقق، کسی ادیب، کسی فلسفی اور کسی شاعر نے عورت کو اتنی عزت اور اتنا بلند مقام نہیں دیا، جتنا کہ علامہ اقبال نے اس کی عظمت اور اقتدار کی حمایت فرماتے ہوئے، اس عظیم تر اعزاز بخشے ہیں۔ اُن کے کلام میں کفِ حنا آلود، زلف و رخسار، فتنہ سامان، شوخی و غمزہ، کلائی اور کنگن، سُرمہ اور آنچل کے عوض عورت کے لیے، شرارِ زندگی، رشکِ ثریا، محافظِ سوزِ حیات، معاونِ دین و سیاست، امینِ شریعت،

پیکرِ رحمت جیسے مقدس اور گراں قدر الفاظ نظر سے گذرتے ہیں، وہ عورت کی زندگی میں قوموں کی زندگی، اور اس کے ہر ہر نفس میں دینِ حق کا سوز، اس کے ضمیر میں ممکناتِ زندگی، اور اس کے تب و تاب میں زندگی کا ثبات پاتے ہیں۔ انھوں نے عورت کو ساری کائنات میں سب سے زیادہ عظیم الشان مرتبہ عطا کیا، اور اُسے چمنستانِ حیات کی کارسازِ جاں بہار فرمایا۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال نہ صرف خواتینِ اسلام کے لیے، بلکہ ہر عورت کے لیے مغربی شوخیٔ انداز، اور کافرنظری کو باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہیں، حُسن و جمال کی نمائش اور نمائشِ حُسن کی آرائش کو عورت کی شان، اس کی تقدیس، اس کی عفّت و عزت اور افتخار و احترام کے سراسر منافی اور موجبِ ذلت سمجھتے ہیں۔ وہ عورت کو فطری اعتبار سے ایک مکمل عورت، ذوقِ روحانیت اور غیرتِ ملّی کا ایک غیر فانی مخزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُسے قدسیت اور پاکیزگی کا مظہرِ اعلیٰ جانتے ہوئے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ عزّتِ نفس کو عہدِ حاضر کے عریاں ضمیر سے محفوظ رکھ! جہاں تابی کے لیے نورِ حق کی پیروی کر کہ وہ بے شمار تجلّیوں کے ساتھ دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب است
کشادش در نمودِ رنگ و آب است

جہانتابی ز نورِ حق بیاموز
کہ اُو با صد تجلّی در حجاب است (ارمغانِ حجاز)

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم خود بھی غور کریں تو ہمارا ضمیر آپ ہی آپ معترف ہوتا جائے گا کہ موجودہ زمانے میں نام نہاد ترقی اور آزادی کے پردے میں ہماری تہذیب کے دامن پر کتنے بدنما داغ نمایاں ہو رہے ہیں؟ اور حصولِ آزادی کے عنوان سے زندگی کے کیسے کیسے جاں پرور اُصول پامال ہو رہے ہیں۔ آزادیٔ اناث کے بارے میں انھوں نے عورت کو مجبور اور معذور نہیں سمجھا، بلکہ زندگی کی ہر شعبے میں شریک ہونے اور حصہ لینے کی ترغیب دلائی ہے۔ مگر احترامِ نسوانیت اور تقدسِ نفس کا تحفظ ہمیشہ شرطِ اولیں گردانا ہے۔ چونکہ بجا اور بے جا کی غلط فہمیاں اُن سے پوشیدہ نہ تھیں، اس لیے فرماتے ہیں۔

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

قند اور زہر کی تاثیر کو جانتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حق اور صداقت کی خودکشی جب دیکھی نہ جا سکی تو فرماتے ہیں۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اسی کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

مغرب کی کی ناعاقبت اندیشی اور بے حیا آزادی کے نتائج کو جب تعلیم کا سبب سمجھا گیا اور بعض کوتاہ بین کم فہم طبقوں میں تعلیم نسواں کے خلاف ہنگامے شروع ہوتے ہیں تو علامہ اقبال کو عورت کی مظلومی اور بے چارگی پر ترس آتا ہے۔ وہ عوام کی نااہلی اور بدذوقی سے جھنجلا اٹھتے ہیں، اور اپنی برہمی کا اظہار خشمگیں انداز میں اس طرح فرماتے ہیں

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ سمجھا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

(ضربِ کلیم)

اقبال نے عورت کے لیے جو نصب العین اور لائحۂ عمل مقرر فرمایا ہے، اسے عہدِ حاضر کی باطل پرست عوامیت نہیں سمجھ سکتی۔ انھیں خود بھی اس کا احساس تھا اور جانتے تھے کہ نئی تہذیب کے پرستاروں سے ان کی ہمنوائی ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، باوجود اس کے حق گوئی کے اس علم بردار نے اظہارِ حقیقت میں کبھی پس و پیش نہیں کیا اور اس پیام حق کو علی الاعلان بار بار دہرایا۔ وہ اپنے اس استقلالِ صداقت پر آپ ہی آپ اس طرح تبصرہ فرماتے ہیں

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

اپنی نواؤں کو صدا بصحرا دیکھتے ہوئے بھی، انھوں نے کبھی نا اُمیدی کا اظہار نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ نا امیدی ان کے ہاں کفر کے مترادف ہے، انھیں کامل یقین تھا کہ ان کا پیام اور ان کا دستور العمل اگر آج ناقابلِ قبول ہے تو کل اس کے نتائج ساری دنیا کے ہم نوا بنا کے رہیں گے اور عالم انسانیت کو اس قدرتی اور فطری قانون کی صداقت کو ماننا ہی پڑے گا لیکن بحیثیت ایک انسان کے ان کا دردمند دل اوروں کی طرح غلط روی اور آثارِ تباہی سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور اپنے مشوروں پر عمل پیرا دیکھنے کے لیے ان کی بے غرض تمنائیں بے تاب ہوتی ہیں اور وہ فرطِ خلوص سے سراپا مضطرب ہوکر اپنی آپ سفارش اس طرح فرماتے ہیں:

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر!
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی!

اقبال نے عورت کو انسانیت سے علیحدہ نہیں سمجھا، ان کے یہاں زندگی کے ہر شعبہ میں "ہم" شریک ہیں۔ آزادی، حقوق اور برتری کے مستحق مانے جاتے ہیں۔ مختصر طور پر چند عنوانات کے ساتھ علامہ اقبال کے اُن خیالات کی تشریح کی جاتی ہے جن کے بارے میں عام غلط فہمی ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اقبال طبقہ نسواں کی تعلیم و ترقی کے خلاف ہیں اور ان کا احترام صرف ایک مذہبی یا ناصح شاعر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔

حجاب

اقبال جب گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے تو انگریزی جرائد میں انھوں نے ایک مضمون شایع کروایا تھا، جس کے ترجمے کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ان خیالات کا اندازہ ہو سکے۔

"یورپ میں عورت اپنے بلند مقام سے گر گئی ہے اور اس کی ذمہ دار وہ خود ہے وہ آزادی اور مساواتِ حقوق چاہتی ہے، جس کا مفہوم وہ خود نہیں سمجھتی"۔

"قرآن میں خلوت و حجاب نسوانی کے بارے میں کئی ایک قوانین پیش کیے گئے ہیں، پردہ اُن میں سے ایک ہے، اس کے علاوہ ایک اور قانون بھی ہے جس کی رُو سے عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اور ہم کلام ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ بے تکلف ہوکر ایک دوسرے کو دیکھنے

کے مجاز نہیں ۔ انھیں تلقین کی گئی ہے کہ ایسے موقع پر اپنی نگاہیں نیچی رکھیں ۔ اگر یہ دستورالعمل عالم گیر ہوجائے تو پھر نقاب کی ضرورت نہیں رہتی ۔ ہندوستان کے دیہات اور دیگر اسلامی ممالک میں اکثر مسلمان عورتیں نقاب نہیں اوڑھتیں ' پردہ دراصل مخصوص نفسی رویّہ کی مادی صورت ہے جس کی ضرورت ہر ملک کے عام حالات اور رفتارِ زمانہ پر منحصر ہے "۔

تربیت اور سیرت سازی

اقبال کے یہاں سیرت سازی اور قومی عروج و زوال کی ذمہ دار عورت ہے' سب سے پہلے اُن کا وہ نظریہ جو خود اُن کے بارے میں پیش کیا جاتا ہے ۔ " والدہ محترمہ کی یاد میں" انھوں نے جو نظم لکھی ہے' اس میں فرماتے ہیں

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا (بانگ درا)

جس طرح دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں نے اپنی شہرت و عظمت کی بنیاد ابتدائی تعلیم اور خصوصاً ماں کی تربیت کو سمجھا ہے' اسی طرح اقبال نے اس نظم میں اس بنیادی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے اپنی سعادت مندی اور ماں کی اعلیٰ تربیت کا ثبوت پیش کیا ہے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کے عروج اور زوال کا انحصار عورت کے اچھے یا بُرے کردار ہی پر رہا ہے ۔ عورت زندگی کی محافظ ہے' وہ جس طرح چاہے اپنے بچوں کو ڈھال سکتی ہے' وہ چاہے تو اُن کے دلوں کو یقین و ایمان سے لبریز کردے' یا الحاد و بے یقینی کی آماجگاہ بنادے' اس نظریہ کی تفسیر علامہ اقبال نے اپنی ایک رباعی میں اس طرح فرمائی ہے کہ نظام عالم کا استقلال ماؤں کے وجود سے ہے' جن کی فطرت امینِ ممکنات ہے جس قوم نے اس کو نہیں سمجھا' اس کا نظام دستور بے بنیاد اور بے ثبات ہے ۔

جہاں را محکمے از اُمہات است
نہاد شاں امین ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند ،
نظامِ کار و بارش بے ثبات است

(ارمغانِ حجاز)

علامہ اقبال نے مثنوی 'رموزِ بیخودی' میں خواتین اسلام کو بڑی قدر و منزلت کے ساتھ ناصحانہ پیرایہ میں مخاطب فرمایا — پرورش اطفال کے بارے میں انھیں جو ہدایت کی گئی ہیں یہاں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے ۔

"اے محترم ہستی ! وقت کی دست درازیوں سے ہشیار رہ ! بچوں کو اپنی آغوشِ شفقت میں چھپا لے، تاکہ وہ زمانے کی مسموم ہوا سے محفوظ رہیں، یہ نونہال جنھوں نے ابھی پَر نہیں کھولے، اپنے آشیانوں سے دُور جا پڑے ہیں، انھیں پھر اپنے مرکز پر لے آ ! تو غیرتِ قومی کی محافظ اور ریاضِ ملت کی آبیار ہے ۔ تیری فطرت پاکیزہ اور تیرے جذبات بلند ہیں اس لیے تو فاطمہؓ بنتِ رسول اللہ کی زندگی پیشِ نظر رکھ ! جو تیری عملی زندگی کے لیے ایک مکمل اور بہترین نمونہ ہے — تاکہ تجھے بھی حسینؓ جیسے فخرِ روزگار اور زندۂ جاوید بیٹے کی ماں بننے کا شرف حاصل ہو"۔

(رموزِ بیخودی)

مذہبی اور قومی خدمت

اقبال نے عورت کے لیے مذہبی اور قومی خدمت کے دروازے بند نہیں کیے، بلکہ انھوں نے مذہب اور ملت دونوں کے لیے عورت کی اعانت کو مقدم اور زندگی کے لیے ناگزیر سمجھا ہے، فرماتے ہیں،

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

قومی خدمت کی حمایت اور ترغیب کے لیے علامہ اقبال کی وہ نظم جس کا عنوان "فاطمہ بنت عبداللہ"

بے پیش کی جاسکتی ہے۔ فاطمہ بنت عبداللہ ایک عرب لڑکی تھی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی۔ اس نظم میں علامہ نے جس درد بھرے انداز میں اُسے مخاطب کیا ہے، وہ ان کے دل کی درد مندانہ کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ اور ساتھ ہی سلسلۂ طبقۂ نسواں کی قومی خدمت اور مذہبی حمایت کی تعلیم اور ترغیب کا پہلو بھی صاف ظاہر ہے۔ اس نظم کے چند شعر درج ہیں:

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے — ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی — غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر — ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی؟
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی؟ (بانگِ درا)

ایک مسلمان لڑکی کی مذہبی خدمت اور قومی ہمدردی نے علامہ کو دخترانِ ملت سے ناامید ہونے نہ دیا۔ اور اُن کے مستقبل کے بارے میں انھیں کچھ امید اور کچھ اطمینان محسوس ہوتا ہے، جس کا اندازہ اُسی نظم کے اس شعر سے ہو سکتا ہے

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

تاریخِ اسلام کے اس مشہور واقعے کو کہ حضرت عمرؓ اپنی بہن سے کلام مجید سُن کر اتنے متاثر ہوئے کہ اسی وقت انھوں نے اسلام قبول فرمالیا۔ دخترانِ اسلام کے سامنے دہراتے ہوئے سفارش کرتے ہیں کہ تو پھر ہماری شام سے ایک نئی سحر پیدا کر اور قرآنی تاثرات کے معجزے دکھا! کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیرے سوزِ قرأت نے عمرؓ جیسے انسان کے دل کو موم کر دیا اور اس کی تقدیر بدل دی:

زشامِ ما بروں آور سحر را
بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را

تو میدانی کہ سوزِ قرأت تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

(ارمغانِ حجاز)

مختصر یہ کہ علامہ اقبال اپنی قوم کے بیدار ہونے اور شاہِ راہ ترقی پر گامزن ہونے کی تمناؤں میں جہاں اپنا خونِ جگر صرف کرتے ہیں، وہاں طبقہ نسواں کے لیے بھی ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر ایک عورت حقیقی معنوں میں عورت کہلانے کی مستحق سمجھی جا سکتی ہے۔ وہ نہ صرف دستور العمل پیش کرتے ہیں بلکہ عورت کی حمایت اور طرف داری میں اپنی قوم کو بے شمار طریقوں سے بار بار اس بنیادی کمزوری کی جانب متوجہ کرتے ہیں کہ عورت کی قدر و منزلت کا جب تک صحیح اندازہ نہ کیا جائے گا، اُس وقت تک مطمئن زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ آپ اپنی ایک فارسی رباعی میں فرماتے ہیں "وہ قوم کتنی خوش نصیب ہے جس کی زندگی میں قیامت کی سی بیداریاں پیدا ہوں اور کسی قوم کے ماضی اور مستقبل کا صحیح اندازہ، کہ اس پر کیا گزری اور کیا گزرنے والی ہے ماؤں کی پیشانی دیکھ کر کیا جا سکتا ہے،

خنک آں ملتے کز وارداتش
قیامت ہا بہ بیند کائناتش
چہ پیش آید چہ پیش اُفتاد اورا
تواں دید از جبینِ اُمہاتش

(ارمغانِ حجاز)

عام نظریئے

(عورت کے بارے میں علامہ اقبال کے عام تاثرات جو فارسی سے ترجمہ کیے گئے)

— عورت وہ برگزیدہ ہستی ہے جو اپنی پاکیزہ محبت سے عشقِ خداوندی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

— فخرِ کائنات نبیؐ آخر الزماں جیسی محترم ہستی نے بھی عورت کو بہت بڑا درجہ عطا

فرمایا ہے' آپ کا ارشاد ہے جنت ماں کے قدموں تلے ہے .

— جو شخص عورت کو خادمہ کا درجہ دیتا ہے وہ قرآن کی حکمت سے بالکل بے بہرہ ہے .

— عورتیں ہمارے لیے خدا کی رحمت ہیں .

— ان کی شفقت پیمبرانہ شفقت کی آئینہ دار ہے اور وہی اپنی تربیت سے آئندہ نسلوں کو سیرت کی تعمیر کرتی ہیں .

— سچ پوچھو تو ہماری ملت کا استحکام عورت کی تکریم سے ہے .

— عورتوں کی پیشانیوں میں ہماری تقدیر کا خط کھنچا ہوا ہے' انھیں کی ہمت سے ہمارے قصرِ ملت کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں .

— میں عورت کے بناؤ سنگھار' اور پُر تکلف آرائشوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتا' جتنا کہ اچھا عقیدہ' زندہ روح' اور درد بھرا دل میرے لیے قابلِ احترام ہے .

— عورت سوزِ حیات کی محافظ ہے' اور اس کی فطرت اسرارِ زندگی کا سرِ ورق .

— عورت کا ضمیر ممکناتِ زندگی سے اور اس کا تب و تاب ثباتِ زندگی سے معمور ہے .

— ہماری تمام سعادتیں اسی کی سعادت سے ہیں اور ہمارے تمام نقوش اسی کے نقش کا ظہور ہیں، خدا نے اگر تمہیں نورِ نظر عطا کیا ہو تو عورت کی قدسیت کا صحیح اندازہ کرو .

(رموزِ بیخودی - جاوید نامہ)

(۲)

اقبال ہماری نظر میں

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں مذہب کی زیادہ ضرورت تہذیب و تمدن اور معاشرت کی بقا کے لیئے ہے ورنہ محض تسبیح اور عبادت کے لیے خدا کے یہاں فرشتوں کی کمی نہ تھی اس لیے خدا کی اس عبادت اور ریاضت کو جس میں دنیا اور دنیا والوں سے نفرت اور بیزاری پیدا ہو' اسلام نے مذموم قرار دیا ہے . چونکہ مذہب اسلام اصلاحِ معاشرت

اور تہذیب کا علم بردار ہے اس لیے اس کی یہ تعلیم ہے کہ خدا کی خوشنودی محض عبادت اور پرستش میں نہیں بلکہ اس کی رضامندی اس میں ہے کہ اس کی مخلوق دنیا میں نیک نفسی یک جہتی اور باہمی اخوت و محبت سے زندگی گزارے تاکہ دنیا کا امن فساد سے بدل نہ جائے ، اگر ایسا نہ ہو اور شر انگیزی بغض و نفاق سے امنِ عالم خطرے میں پڑ جائے تو پھر ساری مخلوق کی عبادت اور ریاضت قطعی بے کار اور بے معنی ہے ۔

اسلامی زاویۂ نگاہ سے اقبال کی شاعری اسلامی تعلیم اور فقہہ کی تفسیر ہے ۔ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اور اس کا نظام شریعت بنی نوع انساں کا ایک بے مثل دستور العمل بن سکتا ہے، لیکن مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی پس و پیش نہیں کہ کلام اقبال میں مخاطب اولیں مسلمان قوم ہے ۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ خود مسلمان تھے اور فرقہ واری ذہنیت نے انھیں اپنی قوم کی جانب مائل رکھا ، بلکہ اقبال کا یہ ایقان ہے کہ انسان کے لیئے اسلامی دستور العمل کے سوا کوئی اور دستور نہ تو قابلِ عمل ہے اور نہ ذریعۂ نجات ۔ اس لیے وہ ہمہ گیر مذہب کو پیغام حق اور لائحہ عمل کی صورت میں ساری دنیا کے لیے پیش کرتے ہیں اور اس عالم گیر انسانی برادری میں خود شریک رہنا چاہتے ہیں۔ زندگی اور خوشگوار زندگی کے لیئے، یہ کتنا پاکیزہ اور وسیع تصوّر ہے ۔

شعری تاثر کا سب سے پہلا اور اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ جذبات کو متاثر کرے، اسی طرح ایک مذہب پرست کا شیوہ یہی ہوتا ہے کہ وہ مذہب کی تبلیغ اور عقاید کی تفہیم و تلقین کرے اور کسی نہ کسی طرح اپنے عقاید کو محض عقاید کی حیثیت سے تسلیم کرائے، اس نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر اقبال کے کلام پر غور کیا جائے تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی جائے گی کہ باوجود مذہب پرست شاعر ہونے کے وہ انسانی تفکر اور ذہنیت کے طبعی میلانات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے، وہ اسلامی ارکان کی صداقت، ابدیت، اور ہمہ گیری پر صرف ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک وسیع النظر انسان کی حیثیت سے بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور اس یقین و ایمان کے ساتھ کہ انسانی ذہن و فکر کا اسلام سے منحرف ہونا ممکن

ہی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے کلام میں اگرچہ الفاظ، ترکیبیں، جدت، دلکشی، جاذبیت تاثیر، اور کمال فن کے ساری خوبیاں شاعرانہ انداز رکھتی ہیں، مگر وہ تفہیم و استدلال اور بحث ایک فاضل حکیم، روشن ضمیر فلسفی، عارفِ کامل اور ایک مقدس پیشوا کی حیثیت سے فرماتے ہیں، ان کے نزدیک عالم حیات کی حقیقی نجات اور معاشرت کے سارے شعبوں کی کامیابی کا انحصار آئینِ اسلام کی پابندی اور نفاذ پر ہے۔

اسلام نے دنیا کو جو سب سے بڑی نعمت دی وہ یہ ہے کہ ہر انسان علم و عمل کے لیے آزاد ہے اور علامہ اقبال اس کے اعتراف میں اسلام کو "ایک وسیع علمی تحریک" قرار دیتے ہیں، اسلام سے قبل جو حقیقتیں کسی نہ کسی طرح مستور تھیں، انھیں اسلام نے بے نقاب کیا اور محض کلام و الہام ہی اسلام کا سرمایۂ دستور نہیں بنا، بلکہ اس دستور العمل کو ایک جیتی جاگتی عملی تصویر یعنی ذات رسالت مآبؐ کو خدا نے اسلامی حُسن صفات اور مظہر اعلیٰ کی صورت میں پیش کیا، جن کی پاک اور مقدس زندگی نے ساری خدائی کو خدا سے روشناس کرایا اور یہ بھی واضح کیا کہ انسان کیا ہے، اور کیا کر سکتا ہے؟

حضور سرورِ کائنات کی زندگی اور اُن کا نظام العمل ہم انسانوں کو خدا کی ذات اور اُس کے صفات سے قریب تر کرتا ہے اور اُن کی پیروی بے مثل بھی ہے، قابلِ تقلید بھی، اور ممکن العمل بھی ــــ خدا نے اپنے حُسنِ صفات کے ایک حسین مجموعہ کو رحمۃ اللعالمینؐ کی شکل میں زمین پر دیکھنا چاہا تھا۔

اقبال علیہ رحمہ کو ذاتِ رسالت مآبؐ سے عقیدت ہی نہیں، بلکہ والہانہ عشق تھا اور یہ اُسی ذاتِ اقدس کے فیضان اور شفقتِ نبویؐ کا اثر ہے کہ آج ہر مسلمان اقبال کی نواؤں میں، اپنے دل کی آواز، اپنی آرزو، اپنی تمنا اور اپنے درد کا درماں محسوس کر رہا ہے، اور اقبال اس کیفِ سرمدی میں ایسے ڈوبے ہیں اور اتنے سرشار ہیں کہ اُن کے لیے اب کسی قسم کی قید و بند نہ رہی، وہ خود بڑھے چلے جا رہے ہیں اور سارے عالم کو آواز دے رہے ہیں کہ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

اقبال کی زندگی کے کئی دور ہیں، ابتدا میں وہ بحیثیت ایک شاعر کے متعارف ہوتے ہیں، اور پھر مصلح قوم اور محبِ وطن کی حیثیت سے منظرِ عام پہ آتے ہیں، کمالِ فن کی راہوں اور عارفانہ منازل کو طے کرتے ہوئے مقام قلندری پر فائز ہوکر پرستارِ ملت اور رہبر کامل مانے جاتے ہیں اُس کے بعد اکتسابِ حقیقت، اور کسبِ صداقت کی رسائی اس مقام محمود پر ہوتی ہے جہاں سے ان کی نواؤں میں پیمبرانہ انداز رونما ہوتا ہے۔

میں نے اس سے پہلے اس امر کو واضح کیا ہے کہ اقبال کو صرف ایک شاعر سمجھنا خطرناک غلطی ہے، اس لیے کہ شاعر فنِ شاعری میں کمال اور عالم گیر شہرت حاصل کرنے کے بعد بھی صرف ایک شاعر ہی رہتا ہے لیکن اقبال اگرچہ شاعر پیدا ہوئے مگر اُن کی زندگی کو نہ تو ایک شاعر کی زندگی کہا جاسکتا ہے اور نہ اُن کی موت ایک شاعر کی موت مانی جاسکتی ہے۔ خود علامہ اقبال نے اس حقیقت کی جانب بار بار متوجہ کیا ہے، کتنے صاف اور غیر مبہم انداز میں فرماتے ہیں۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

بانگ درا میں وہ بے چین، متجسّس اور متلاشی نظر آتے ہیں تو بالِ جبریل میں مطمئن اور پرسکون دکھائی دیتے ہیں، خودی اور بے خودی کی حکیمانہ شان، اور پیامِ مشرق کی فلک پیمائیوں سے گزر کر ضربِ کلیم میں ان کے جلالِ تقدس اور عارفانہ کمال کا اظہار ہوتا ہے، البتہ اُن کی کاملانہ شان اور پیمبرانہ انداز کی تجلیاں جاوید نامہ میں اپنی انتہائی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور ان کی مخاطبت ایک ایسے بلند مقام سے ہوتی ہے کہ دنیا والے محسوس کرتے ہیں کہ انسانوں نے عالم بالا پر اپنا ایک ایسا نمائندہ بھیجا ہے جو وہاں کے واقعی حالات، مسائل اور معاملات سے لحظہ بہ لحظہ انھیں باخبر کر رہا ہے۔ یہ ہے

علامہ اقبال کی پیمبرانہ شاعری کی ایک مختصر سی رُوداد - کہ وہ شاعر، حکیم، مصلح، فلسفی اور مومن کی منازل سے بتدریج گزرتے ہوئے عارفانہ کمال کی بلندیوں پر فائز ہوتے ہیں اور بالآخر اُن کے فقرِ غیور کو بارگاہ خداوندی سے نیابتِ رسول کے مماثل ایک عظیم الشان اعزاز سرفراز ہوتا ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دئے ہیں اندازِ خسروانہ

اقبال سے ایک دن اُن کے ایک دوست نے سوال کیا کہ "آپ کے نزدیک دنیا کا سب سے زیادہ مظلوم کون ہے؟" اقبال نے فرمایا "قرآن"! اُن کے دوست نے حیرت سے پوچھا وہ کیسے"؟ تو آپ نے فرمایا" میرے نزدیک قرآن سب سے زیادہ مظلوم اس لیے ہے کہ اس کا ترجمہ ایسے لوگ بھی کرتے ہیں جو عربی زبان نہیں جانتے"۔ اگر یہی سوال آج مجھ سے کیا جائے تو میرا جواب یہ ہوگا کہ دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم مسلمان عورت ہے' وہ اس لیے کہ اُس کی زندگی اور نظام معاشرت کی باگ ڈور ان ہاتھوں میں ہے' جو اس کے مقصدِ حیات اور عظمتِ حقوق سے تو کیا خود اپنے فرائض اور جادۂ منزل سے بھی واقف نہیں۔ مسلمان عورت اور بالخصوص ہندوستان کی مسلمان عورت' آج اقوام عالم میں سب سے زیادہ مصیبت زدہ ہے۔ اُس کے مستقبل کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اس کے مذہبی پیشواؤں کے مختلف عقائد اور ان کے باہمی اختلافات نے اس کے نظام زندگی کے سارے اصول و قوانین کو اس قدر درہم و برہم کیا ہے کہ اب اس کا اپنا کوئی نظام العمل باقی نہیں رہا۔ کوئی قانون' کوئی دستور اس کے بس کا نہیں۔ وہ تہی دست اور بے سروساماں زندگی کے ہر شعبہ میں بے گانہ وار گھوم رہی ہے۔ شاہراہ ترقی تو بڑی بات ہے' اُسے تو اب قدم جمانے کے لیے بھی کوئی سہارا نہیں' اُسے یہ سوچنے کی بھی اجازت حاصل نہیں کہ وہ کیا ہے اور اسے کیا کرنا ہے؟ اس کی حیات کا آخر مقصد کیا ہے؟ اس کے مقاصد اس کے عزائم ہر سمت سے پامال کئے جا رہے ہیں۔ وہ ایک بے ضرورت تودۂ خاک' ایک

بے کیف راگ، ایک بے مقصد حیات اور ایک بے معنی معمّہ بنادی گئی ہے۔ اس کی زندگی کی کوئی منزل نہیں اس کی حیات کا کوئی مقصد معیّن نہیں، کارگاہ ہستی میں اس کا وجود آج بے سہارا اور معلّق ہے! تہذیب کا تقاضا کچھ ہے تو تعلیم کا نظریہ کچھ اور، قرآن کے احکام کچھ ہیں تو مفتیوں کے فتوے کچھ اور، حدیث نبوی میں کچھ ارشاد ہے تو مرشدوں کی تفہیم کچھ اور ہے، فقہہ کے مطالب کچھ ہیں تو واعظوں اور پیشوایانِ مذہب کی تاویلیں کچھ اور! تاریخ سے کچھ پتہ چلتا ہے تو قاید اور رہنما کچھ اور کہتے ہیں۔ اگر یہ خود اپنی مرضی سے کوئی نصب العین معیّن کرلے تو علامہ اقبال کچھ اور فرماتے ہیں۔ بہرحال اس کشمکش کا وبال اس کی زندگی، اس کے وقار اور اور اس کی خودداری پر روز بروز مصیبت بن کر چھاتا جارہا ہے

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے؟
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

ضرورت اب اس کی ہے کہ خود عورت خوابِ غفلت سے بیدار ہوکر اپنے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو بیدار کرے اور اپنی خود اعتمادی پر بھروسہ کرنا سیکھے۔ اب اُسے خود ایک ایسا نظام العمل مرتب کرنا چاہیے جو زمانہ حاضر کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ قومی اور مذہبی حیثیت سے اطمینان بخش ہو اور اپنی صنف کی رہنمائی کے لیے قابلِ قبول بھی۔ انفرادی نظریہ یا فیصلہ، زندگی کے دستور کا مقنّن نہیں ہوسکتا، تاوقتیکہ حالاتِ زمانہ، تہذیب و تمدن، عقل و دانش، مذہب و ایمان، خلوص و صداقت اور رضائے خداوندی اس کے شاملِ حال نہ ہو۔ موجودہ زمانے میں مسلمان عورت کی رہنمائی کے لیے، اقبال کی تسلیم میں یہ ساری خوبیاں بہ یک وقت پائی جاتی ہیں۔

وہی جہاں ہے ترا، جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہ صبحگاہ میں ہے

(بالِ جبریل)

اقبال نے ہمارے لیے جس مقام کی نشان دہی کرتے ہوئے دستور العمل مرتب کیا ہے وہ آئینِ فطرت کے عین مطابق ہے اور انھوں نے جو حدود اور تعینات قائم کیے ہیں وہ محض اُن کے انفرادی غور و فکر کا نتیجہ نہیں، بلکہ وہ سب کچھ قرآنی حقایق کی تفسیر ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر ہر عورت اس عظمت کو اور اس عظیم الشان مقام کو حاصل کر سکتی ہے جو اقبالیات میں عورت کا پیدائشی حق مانا جاتا ہے۔

اقبال نے جہاں اسرارِ حیات اور حقایق زندگی کے خزانے سارے عالم کے لیے بکھیر دیے اور نوع انسان کے لیے اپنے سوزِ یقین اور خونِ جگر سے پلی ہوئی امیدوں کے ایک ابدی چمن کو ترکے میں چھوڑا ہے۔ وہاں انھوں نے نسوانی دنیا کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ دخترانِ ملت کو اُن بے بہا جواہرات سے مالا مال کیا ہے جن کی کوئی نظیر اور کوئی بدل نہیں، جن کی آب و تاب ابدی، اور حُسن لازوال ہے۔

ہمارا ضمیر مطمئن ہوتا ہے اور ہمیں ایک تسلی بخش سکون محسوس ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگی کے آئین، اور جادۂ منزل کے نشان، قدیم زبانوں کی ضخیم جلدوں، اور نام نہاد مولویوں، ملاؤں اور مفتیوں کے تنگ و تاریک ذہنوں سے نکل کر، یقین و عمل کے نورانی سانچوں میں، عصری زبان کی بے شمار رعنائیوں کے ساتھ اقبالستان کی خوب صورت جلدوں میں محفوظ ہو چکے ہیں۔

ہم میں سے کوئی اگر کسی عقدۂ لاینحل میں اُلجھ جائے اور تعلیماتِ اقبال سے استفادہ چاہے تو ایک دھیمی سی آواز، ایک ہلکی سی گونج محسوس ہوتی ہے اور پھر خلوصِ باطن سوزِ یقین میں ڈوبا ہوا ایک کیفِ ترنم ہمارا یوں خیر مقدم کرتا ہے

نہ ستارے میں ہے، نے گردشِ افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے (بال جبریل)

ضرورت اب اس بات کی ہے کہ طبقۂ نسواں میں اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش خود طبقۂ نسواں کرے، اور اس غلط فہمی کو دور کیا جائے جو عوام کی ذہنیتوں پر مسلط

ہے کہ اقبال محض ایک مذہبی شاعر اور ایک قلندر منش فلسفی بھی تھے اس لیے ان کے عقاید بھی عورت کے بارے میں رجعت پسندانہ تھے۔

میں اس واقف ہوں کہ اکثر خواتین علّامہ اقبال کو محض ایک مشہور اور بلند پایہ شاعر سمجھتی ہیں اور ان کی تعلیم پر غور کرنے اور سمجھنے کی بہت کم کوشش کی جاتی ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ انھیں تعلیم نسواں اور بیداریٔ اناث کا مخالف سمجھا جاتا ہے، اور انھیں بہی خواہِ نسواں سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے — عورت کی کم نصیبی کا یہ بھی ایک بین ثبوت ہے۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید — وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری — جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی مہجوری

دورِ حاضر میں مسلمان عورت کے لیے تعلیماتِ اقبال ہی ایک نعمت اور ذریعۂ نجات ہے۔ اقبال کی تعلیم اسلام اور قرآن کی تعلیم ہے اور وہ کون ہوگا جسے ان دونوں کی حمایت اور صداقت سے انکار ہو۔

مسلم خواتین میں اگر زندگی کے آثار باقی ہیں، اور وہ موجودہ آلام و مصائب سے نکل کر مطمئن اور آسودہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں تو، ان کا اولین فرض یہ ہونا چاہیئے کہ اقبال کے کلام کا گہرا مطالعہ کریں اور اپنی روزمرہ زندگی کے اوقات میں اس کے لیے بھی کچھ وقت نکالیں۔ عمل تو دور کی بات ہے صرف یہ سمجھنے کی کوشش جاری رہے کہ علامہ اقبال کی نظر میں "ہم" کیا ہیں؟ اور ہمارے متعلق اُن کا ارشاد کیا ہے؟

چونکہ اقبال کا کلام جدید شاعری کا بلند ترین شاہ کار اور عہدِ حاضر کے پسندیدہ ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ ہمارے ذوق پر گراں نہیں گزرتا۔ اگر ہم ذرا سی توجہ سے کام لیں تو ہمارے طبعی میلانات اور ہمارا ذوقِ صحیح خود بخود مائل اور مانوس ہوتا جائے گا۔

اس زندگی میں ایک اور زندگی کا خیال رکھنے والے بہت کم ہوتے ہیں، لیکن

سمجھ داری کا تقاضا تو یہ ہے کہ ناپائیدار کے عوض، پائیدار کو ترجیح دی جائے۔
اقبال کے کلام میں زندگی اور ماورائے زندگی، دونوں کے لیے ثبات و سکون کا سامان موجود ہے اور روحانی عظمت اور دنیوی اعزاز کے گراں قدر مشورے بھی ملتے ہیں۔
بہ حیثیت انسان کے ہمیں عقل سلیم کی ضرورت ہے اور اگر ہم صاحب فہم ہیں تو کیا ہمیں ایک مذہب کی حاجت نہیں۔ اور اگر ہم زندہ ہیں تو زندگی کے لیے یقیناً ہمیں ایک مستحکم نظام زندگی کی ضرورت ہے اور نظام زندگی کا استحکام کیا جوش عمل کے بغیر ممکن ہے؟
بہرحال ہماری تمام مشکلات کا حل، اقبال کے ہاں موجود ہے جس سے مستفید ہو کر ہم روحانی پاکیزگی اور خدا کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور خدا کی خوشنودی کیا ہے؟ یہ ایک ایسی نعمت ہے جس کی تعریف میں کون و مکان قاصر ہیں۔ اُسے تو صرف غور اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ "ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ"

••

محمد ظہیر الدین احمد

پروفیسر غلام دستگیر رشید، ایک صاحبِ نظر اقبال شناس

تاریخ پیدائش: ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۸ء : تاریخ وفات ۲۵ر اپریل ۱۹۹۲ء

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید ایک بلند پایہ عالم اور ماہر اقبالیات تھے۔ خصوصاً نئی نسل کو اقبال سے روشناس کرنے میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد موصوف کی سرپرستی ہمت افزائی اور گرمجوشانہ تعاون کے لیے ممنونِ احسان ہے۔ انھوں نے سال گذشتہ ماہ اپریل ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ انھیں مقاماتِ عالیہ سے سرفراز فرمائے۔ ان کی پہلی برسی کے موقع پر یہ خاکہ پیش خدمت ہے)

پروفیسر غلام دستگیر رشید کی رحلت کے بعد جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو ان کی شخصیت کی کئی جھلکیاں میرے چشمِ تصور میں ابھرنے لگتی ہیں۔ مسجد عامرہ ہو یا مسجد باغِ عامہ یا کوئی اور محدود نشست کبھی وہ آیاتِ قرانی کی دل نشین انداز میں تفسیر بیان کر رہے ہیں۔ تو کبھی ہزاروں کے اجتماع میں سیرتِ طیبہ پر روح افروز تقریر کر رہے ہیں۔ تقریر کا اسلوب ایسا کہ عالم اور عامی سب ہی کے قلوب میں ان کی بات اتر رہی ہے۔ کہیں کلام اقبال کے اسرار و رموز کھول رہے ہیں، کہیں شاعر کی حیثیت سے رنگین اور شوخ کلام سناتے ہوئے محظوظ کر رہے ہیں۔ کبھی کسی محفل میں ایک طالب علم کی طرح دوسروں کی تقریریں پوری توجہ اور انہماک سے سُن رہے ہیں۔ سوالات بھی کر رہے ہیں، کہیں حلقہ یاراں میں اپنی زندہ دلی اور مزاح سے محفل کو زعفران زار بنا رہے ہیں۔ یہ جھلکیاں شنیدہ نہیں دیدہ کے درجہ میں آتی ہیں اور یہ یادیں کم کم ہی سہی تقریباً تیس سال سے زاید عرصہ پر محیط ہیں۔

گہری اور وسیع علمیت کے ساتھ وسعتِ نظر اور فکری توازن، حکمت اور نکتہ آفرینی، صوفیانہ

ذوق، اور قلندرانہ مزاج، انکسار اور تواضع، بذلہ سنجی اور خوش مذاقی، طالب علموں کے ساتھ محبت اور شفقت، یہ ڈاکٹر رشید کے خاص اوصاف تھے۔

خود ان کی اپنی شخصیت کی نشوونما کا سفر اوروں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ اس کی مثالیں اب شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ ان کے قریبی دیرینہ رفیق خواجہ حمید احمد صاحب کی روایت کے مطابق جب انھوں نے اپنے آبائی وطن نلگنڈہ سے حصول علم کے لیے حیدرآباد کا قصد کیا تھا تو مالی مشکلات کی وجہ سے تقریباً اسّی (۸۰) میل کا سفر پیدل طے کیا۔ ٹیوشن کے ذریعہ اپنے اخراجات کی سبیل نکالی۔

ڈاکٹر رشید کی تاریخ پیدائش ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۸ء اور مقام پیدائش ضلع نلگنڈہ۔ وہ مولوی غلام محی الدین صاحب خزانہ دار کے فرزند تھے۔ حیدرآباد آنے کے بعد پہلے منشی کا امتحان دیا۔ انگریزی کا امتحان دے کر میٹرک کی سند حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ سے ایم۔ اے تک عثمانیہ یونیورسٹی ان کے حصولِ علم کی آماجگاہ رہی۔ ۱۹۳۲ء میں جب انھوں نے ایم اے (فارسی) میں امتیازی کامیابی حاصل کی تو انگریزی ادبیات کے پروفیسر مسٹر اسپیٹ نے ان کی قابلیت اور لیاقت کے بارے میں یوں تبصرہ کیا تھا:

"وہ اعلیٰ تصورات اور غیر معمولی قوتِ اظہار کے حامل ہیں۔ اُن کی گفتگو پُر اعتماد اور ان کا طرزِ استدلال پختہ کار اہلِ فکر کی یاد دلاتا ہے۔"

شعبۂ اردو ناگپور یونیورسٹی سے بھی ایم۔ اے کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ "فارسی میں نعتیہ شاعری کا ارتقاء" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی تکمیل کی۔ تقریباً بارہ سو صفحات پر مشتمل یہ مقالہ ان کی آٹھ سالہ علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ مقالہ پانچویں صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے طویل عرصہ پر محیط فارسی شاعری کے مطالعہ کا طلب گار تھا۔ سنائی، خاقانی، نظامی، عطار، رومی، خسرو، جامی، اقبال اور کئی شاعروں کے دواوین کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا۔ نعتیہ شاعری پر مبنی کلام کا انتخاب، ان کی تشریح اور توضیح کے سلسلہ میں ڈاکٹر رشید کی صلاحیت کا اندازہ خود ان کے استادِ محترم مولانا مناظر احسن گیلانی کی اس رائے سے ہوتا ہے جو انھوں نے اس مقالہ

کے بارے میں ریسرچ بورڈ میں دی تھی کہ " شاعروں کی طویل فہرست میں کلام کا انتخاب شعر کی نزاکت اور معنویت کی پرکھ اور اس کے اظہار کا سلیقہ ضمناً ہی سہی خود فارسی شاعری جن تغیرات و انقلابات سے گزری ہے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت، فارسی شاعری اور ادب کے علاوہ اسلامی تصوف کے اسرار و حقایق کے مطالعہ کے بغیر وہ اس مقالہ کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے"۔

وہ طویل عرصہ تک نظام کالج میں فارسی کے استاد رہے۔ ۱۹۶۴ء میں بہ حیثیت صدر شعبہ فارسی وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا۔ اس کے بعد پروفیسر ایمریطس رہے۔ صدر جمہوریہ ہند نے ان کی اعلیٰ خدمات پر اعزاز عطا کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالقدیر حسرت، مولانا الیاس برنی سے وہ بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے ان بزرگوں سے فیض پایا۔ اور یہ شاگرد رشید رہے۔

ترتیب، تالیف اور تصنیف کے میدان میں ان کے علمی کارنامے اسلامیات، تصوف اقبالیات اور فارسی و اردو ادبیات پر محیط ہیں۔ اسلامیات کے ضمن میں ان کی اولین تالیفات میں تعلیم القرآن شامل ہے۔ اس تالیف میں جناب عبدالرحمٰن سعید ان کے شریک رہے۔ اسلامی تہذیب کیا ہے، اسلام کے معاشی تصورات، اسلام کے سیاسی تصورات، اسلامی تقاریب وغیرہ جیسے موضوعات پر صف اول کے علما اور اسکالرس کے بلند پایہ مضامین کو مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ مضامین ان کے حسن انتخاب کی دلیل ہیں۔ انھوں نے درجہ نہم کے لیے رسالہ دینیات کی بھی تالیف کی۔ اسلام کے معاشی فلسفہ اور نظریات سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی جس کا اندازہ اسلام کا معاشی فلسفہ، اسلامی اشتراکیت، اسلام کے معاشی رجحانات اور اشتراکی روایات وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھے گئے مقالات سے ہوتا ہے۔ انھوں نے مدراس یونیورسٹی میں توسیعی خطبات دیے۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا خلاصہ The Concept of Perfect Man in Persian Poetry کے نام سے شائع کیا۔ جامعہ دارالعرفان کا نصاب مرتب کیا اور اس ادارہ کے صدر نشین رہے۔

تصوف میں کئی اہم مقالات کے علاوہ' ان کا اہم کارنامہ غزلیاتِ رومی پر تاریخی تنقید اور تبصرہ پر مبنی "شمسِ معنوی" کی اشاعت ہے جو غالباً ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس کتاب کی ستائش کرتے ہوئے لکھا کہ "تحقیق و ترتیبِ مواد اور طرزِ استدلال و اظہار لایق داد ہیں"۔ اس کے علاوہ خسرو کے شاہکار دیوان "غرّۃ الکمال" کو انھوں نے کئی ضروری توضیحات اور تشریحات کے ساتھ ایڈٹ کیا۔ علامہ اقبال سے ڈاکٹر رشید بے حد متاثر تھے۔ حیدرآباد میں اقبال شناسی کے فروغ میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ مطالعۂ اقبال کے ضمن میں نئی نسل اُن کی ممنونِ احسان ہے۔ اقبالیاتی ادب کے ابتدائی دور ہی میں انھوں نے اقبال کے فکر و فن پر مشتمل تین کتابیں آثارِ اقبال' حکمتِ اقبال اور فکرِ اقبال مرتب کیں۔ اقبالیات پر کئی اہم مضامین لکھے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ انھوں نے اقبال سے رموزِ بیخودی کے ترجمہ کی اجازت چاہی تھی۔ جس کے جواب میں اقبال نے بھوپال سے اپنے مکتوب مورخہ ۲ مارچ ۱۹۳۵ء میں انھیں لکھا: "رموزِ بیخودی کا ترجمہ انگریزی اگر آپ کرنا چاہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ البتہ دو باتیں ضرور عرض کروں گا' ایک یہ کہ ترجمہ کی مشکلات اتنی ہیں کہ مترجم کا دل توڑنے کے لیے کافی ہیں' دوم یہ کہ میں خود ترجمہ کی اصلاح نہیں کر سکتا"۔ اقبال کے اس خط میں انگریزی میں ترجمہ کا ذکر ہے لیکن ڈاکٹر رشید نے اُردو میں رموزِ بیخودی کا ترجمہ کیا تھا جو شایع نہیں ہوا۔ یہ مسودہ اور علامہ اقبال کا اصل مکتوب انھوں نے اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کو مرحمت فرمایا۔ ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال کے لکچرس منعقدہ ٹاؤن ہال باغ عامہ حیدرآباد میں وہ شریک رہے۔ نواب بہادر یار جنگ کی دیوڑھی پر منعقد ہونے والی درسِ اقبال کی محافل میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد اقبالیات پر ان کی تقاریر سے استفادہ کرتی رہی۔ جاوید نامہ پر ان کے درس کا اہتمام کیا گیا چند لکچرس کے بعد ان کی علالت کی وجہ سے یہ سلسلہ ناتمام رہا۔ اقبالیات پر ان کی خدمات کے اعتراف میں اپریل ۱۹۸۵ء میں اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے ان کی خدمت میں پہلا اقبال ایوارڈ پیش کیا گیا۔ افسوس علم و حکمت کی یہ شمع ۲۵ اپریل ۱۹۹۲ء کو بجھ گئی۔

اقبال اکیڈمی حیدرآباد کی سرگرمیاں

۱۔ روئداد اجلاس ارکانِ تاسیسی (منعقدہ ۳ر جنوری ۱۹۹۲ء)

اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے ارکانِ تاسیسی کا ایک اجلاس بتاریخ ۳ر جنوری ۱۹۹۳ء سہ پہر دفتر اکیڈمی پر منعقد ہوا جس میں پروفیسر سید سراج الدین، جناب شاہد حسین، ڈاکٹر تیج نارائن جیسوال، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر سلطان عمر، محترمہ سلیم النساء، قاضی انجم عارفی، جناب محمد ظہیر الدین اور جناب کریم رضا نے شرکت کی۔ جناب محمد ظہیر الدین نائب صدر نے صدارت کی۔

ابتدا میں بانی و صدر اقبال اکیڈمی کے سانحۂ انتقال پُر ملال پر قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

اس اجلاس نے مجلوعہ نشستوں پر حسبِ ذیل اصحاب کے بہ حیثیت ارکانِ تاسیسی شمولیت کی منظوری دی۔

۱۔ جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر ریاست ۲۔ جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ

۳۔ جناب سید الطاف حسین

حسب ذیل اصحاب کا انتخاب بہ حیثیت ارکان مجلس عاملہ دو سال کے لیے کیا گیا۔

۱۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی ۲۔ جناب سید عبدالقدوس ایڈوکیٹ ۳۔ جناب وجیہ الدین احمد

۴۔ جناب وہاج الدین ۵۔ جناب عبدالوہاب قریشی

ارکان تاسیسی نے پروفیسر سید سراج الدین کو اقبال اکیڈمی حیدرآباد کا صدر منتخب کیا۔

اس کے بعد منتخب صدر کی صدارت میں اجلاس کی کارروائی جاری رہی۔ جس میں جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ اور جناب سید الطاف حسین کے علاوہ متذکرہ بالا ارکان مجلس عاملہ شریک رہے۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد نے جون ۱۹۹۰ء تا ڈسمبر ۱۹۹۲ء کے دوران اکیڈمی کی سرگرمیوں سے متعلق رپورٹ پیش کی۔

پروفیسر سراج الدین نے تقسیم کار کے ضمن میں حسب ذیل اصحاب کی نامزدگیاں عمل میں لائیں۔

نائب صدر: جناب محمد ظہیر الدین احمد معتمد: جناب کریم رضا

شریک معتمدین : جناب وہاج الدین اور جناب وجیہ الدین احمد
خازن : جناب عبدالوہاب قریشی صدر مجلس مالیہ: جناب عبدالقدوس ایڈوکیٹ
معتمد مجلس مالیہ : جناب شاہد حسین معتمد مجلس علمیہ : جناب علی ظہیر
معتمد محافل فکر : ڈاکٹر سلطان عمر انچارج امور اقبال ریویو : ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

۲۔ روئداد اجلاس مجلسِ عاملہ (منعقدہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۳ء)

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۲۶ جنوری ۱۹۹۳ء پروفیسر سید سراج الدین صدر اقبال اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ، جناب سید الطاف حسین، جناب شاہد حسین، جناب سید عبدالقدوس ایڈوکیٹ، جناب مظہر اللطیفی، جناب وجیہ الدین احمد، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، جناب عبدالوہاب قریشی، جناب محمد ظہیر الدین، جناب کریم رضا کے علاوہ بہ حیثیت مدعوین خصوصی محترمہ صالحہ الطاف اور ڈاکٹر یوسف حامدی نے شرکت فرمائی۔

سابق اجلاس ارکانِ تاسیسی میں پیش کردہ رپورٹ کی روشنی میں رکنیت سازی اقبال ریویو، محافل فکر اور نئی نسل کے لیے بزم اقبال کے مراکز کے قیام کے سلسلہ میں پروگرام مرتب کیا گیا۔ محترمہ صالحہ الطاف نے آسان اقبالیاتی ادب کے سلسلہ میں بچوں کے لیے اقبال پر ایک کتاب کی تالیف کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ بچوں کے لیے اقبال کی نظموں کی آسان تشریح پر مشتمل کتاب کی تالیف کے لیے جناب مضطر مجاز کا نام تجویز کیا گیا۔ پروفیسر سراج الدین نے اپنی صدارتی تقریر میں اکیڈیمی کے دائرہ کار کی وسعت اور استحکام کے لیے معزز اراکین سے تعاون پر زور دیا۔

۳۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے نئے صدر پروفیسر سراج الدین کا تعارف

پروفیسر سید سراج الدین نے ۱۹۵۷ء سے عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کی تکمیل کی۔ علاوہ ازیں اٹلی میں اطالوی اور ادبیات کی تعلیم حاصل کی۔ اُردو، فارسی کے علاوہ وہ جرمن اور فرانسیسی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر رہے۔ اور بہ حیثیت پرنسپل پوسٹ گرایجویشن کالج عثمانیہ یونیورسٹی وظیفہ حسن خدمت

حاصل کیا۔ ان کے بلند پایہ مضامین مختلف علمی و ادبی جرائد میں شایع ہوئے۔ وہ ایک تخلیقی ذہن رکھنے والے ماہر اقبالیات ہیں۔ ان کا تقریر اور تحریر کا اسلوب نہایت دل نشین اور بلیغ ہوتا ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر (کشمیر) نے اقبالیات سے متعلق اہم موضوعات پر ان کے لکچرس کا اہتمام کیا۔ پروفیسر سید سراج الدین حیدرآباد سے شایع ہونے والے مشہور عالم انگریزی جریدہ اسلامک کلچر کے ایڈیٹر اور اسلامک کلچر کے گورننگ بورڈ اور ایڈیٹوریل بورڈ کی سکریٹری کی حیثیت سے اہم علمی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

○○

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی مطبوعات

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی درج ذیل مطبوعات دستیاب ہیں جو دفتر اکیڈیمی سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ اقبال نئی تحقیق (اسٹیٹ آرکائیوز کے ریکارڈ پر مشتمل) مرتب سید شکیل احمد

۲۔ اقبال: کشش اور گریز
پروفیسر عالم خوندمیری کے مضامین کا مجموعہ مرتب محمد ظہیر الدین احمد

۳۔ افکارِ تازہ
پروفیسر صلاح الدین کے مضامین کا مجموعہ مرتب محمد ظہیر الدین احمد

۴۔ مقالات عالمی اقبال سیمینار مرتب کریم رضا

رپورٹ کارکردگی اقبال اکیڈمی حیدرآباد

جون ۱۹۹۰ء تا دسمبر ۱۹۹۲ء

پیش کردہ جناب محمد ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈمی حیدرآباد
بہ اجلاسِ عاملہ منعقدہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۳ء

صدر ذی قدر و معزز اراکین مجلس عاملہ اقبال اکیڈمی حیدرآباد

آج ہمارا اجلاس ایک ایسے موقع پر منعقد ہو رہا ہے، جب کہ اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے بانی اور صدر محترم جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اُن کی بے وقت شاندار کارناموں اور خدمات میں اقبال اکیڈمی حیدرآباد کا قیام بھی شامل ہے۔ ان کا ایک اہم کارنامہ ہندوستان میں فکرِ اقبال کی شمع کو فروزاں رکھنا ہے۔ تقسیم ہند کے حالات میں اقبال کو ایک خاص خطہ ارض سے وابستہ کر دیا گیا تھا اور ہندوستان میں ان کا نام لینا فرقہ پرستی سمجھا جاتا تھا لیکن انھوں نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ اقبال کے پیام حرکت و حیات کو جغرافیائی خانوں میں نہیں باٹا جاسکتا۔ یہ پیام ساری انسانیت کی میراث ہے اور خصوصاً آزاد ہندوستان میں اقبال کی فکر اور زیادہ بامعنی بن گئی ہے۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب کی رہنمائی میں اقبال اکیڈمی حیدرآباد نے ہندوستان میں ایک باوقار ادارہ کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ جس کی مساعی کی ستائش ہندوستان سے باہر بھی ہونے لگی ہے۔ موصوف کی المناک جدائی ہم سب کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ مجلس عاملہ اقبال اکیڈمی حیدرآباد موصوف کی خدمات کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے۔ اس موقع پر مجھے یہ بات کہنے کی اجازت دیجیے کہ جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب کی پُرملال رحلت نے ہماری ذمہ داریوں میں یوں اضافہ کر دیا کہ اُن کے چھوڑے ہوئے مشن کی تکمیل میں ہم اپنی بساط کے مطابق بھرپور کوشش جاری رکھیں اور کاروان کو منزل

سے ہم کنار کریں۔

معزز اراکین

آپ کو یاد ہوگا کہ اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر اس احقر کو صدر اقبال اکیڈیمی جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب نے اس بات کی ہدایت دی تھی کہ اقبال اکیڈیمی کی تنظیم جدید کرتے ہوئے اس ادارہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا جائے۔ مجھ جیسے کم مایہ اور محدود صلاحیت رکھنے والے ایک کارکن پر اس اعتماد کے لیئے میں اُن کا ممنونِ احسان ہوں۔ میں اس موقع پر تنظیم جدید کے بعد یعنی جون ۱۹۶۰ء سے ڈسمبر ۱۹۹۲ء تک اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیوں کی ایک مختصر رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ رکنیت سازی :۔ پچھلے اجلاس میں اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی سرپرستی، تاحیات اور سالانہ رکنیت کا زرِ تعاون علی الترتیب ۵ ہزار، ۵۰۰ سو اور ۲۵ روپے مقرر کیا گیا تھا اور معزز اراکین سے اس بات کی اپیل کی گئی تھی کہ وہ رکنیت سازی اور اکیڈیمی کے تعارف کے لیے اپنے طور پر ذمہ داری قبول فرمائیں۔ اب تک جملہ ۶۳ اصحاب اکیڈیمی سے منسلک ہوئے ہیں۔۔ یہ بات واضح رہے کہ متذکرہ تعداد حوصلہ افزا نہیں ہے۔ رکنیت سازی، اکیڈیمی کی آمدنی کا اہم ذریعہ ہے۔ ہر سال رکنیت کی تجدید بھی ایک انتظامی دشواری ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہمدردوں کو کم از کم ۴ سال کے لیے زرِ تعاون ادا کرنے کی گذارش کی جائے۔ شہر حیدرآباد میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اقبال اکیڈیمی کی مساعی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان سے تعاون حاصل کرنے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ معزز اراکین اور ہمدردان شخصی ربط پر توجہ فرمائیں اور رکنیت قبول کرنے کی ترغیب دیں اور دیگر مقامات پر بھی رکنیت سازی کے لیے کوشش کی جائے۔

اجتماعات : حسبِ روایت تقریباً ہر ماہ اجتماعات کا سلسلہ جاری رہا۔ یومِ اقبال، محافلِ اقبال اور علمی مذاکرات کا معیار خاصا معیاری رہا (جملہ ۲۱) آپ جانتے ہیں کہ اقبال اکیڈیمی کے فورم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں ہر مکتبِ فکر کے اربابِ علم و دانش کو مدعو کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان اجتماعات میں پہلی مرتبہ بعض علمی شخصیتوں کو استفادہ کے لیے مدعو کیا گیا۔ ان اجتماعات کا ایک اہم اور نیا رُخ

محافلِ فکر کا انعقاد ہے۔ جس کی نوعیت GROUP DISCUSSIONS کی ہوتی ہے۔ نہ صرف اقبالیات سے راست متعلق موضوعات پر بلکہ اہم عالمی، قومی، ملّی مسائل سے متعلق موضوعات پر غور و فکر اور تجزیہ کے لیے مختلف مکاتیب خیال کے ارباب فکر نے اظہارِ خیال کیا جن پر مباحث بھی ہوئے۔ آئندہ یہ بات پیش نظر ہے کہ اہم ملّی اور قومی مسائل کے تجزیے اور ضروری معلومات اکٹھا کی جائیں اور ان لوگوں کی خدمت میں یہ تجزیے روانہ کیے جائیں جو علمی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ محافلِ فکر کا یہ فورم اس اعتبار سے اہم خدمت انجام دے سکے گا اور شاید سنجیدہ اور مخلصانہ غور و فکر کے نتیجہ میں اربابِ فکر کا ایک گروہ اُبھر سکے گا۔

• کتب خانہ :- اس وقت اقبال اکیڈیمی حیدر آباد کا کتب خانہ تقریباً (۷ ہزار) کتب پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ معیاری رسائل جن میں بیشتر قدیم رسائل اِس لائبریری میں موجود ہیں جن کی تعداد ($1\frac{1}{2}$ ہزار) ہے۔ اس کتب خانہ کے شعبہ اقبالیات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اقبالیات پر کتب اور خصوصی جرائد کا ایسا ذخیرہ کہیں اور موجود نہیں ہے۔ اس کتب خانہ میں نادر تصاویر اور خطوط بھی شامل ہیں۔ یہاں اس کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ فی الوقت ایک رجسٹر تیار کیا گیا ہے۔ فن واری تبویب کا کام شروع نہیں کیا جا سکا۔ اس کام کے لیے ایک مستقل لائبریرین کی شدید ضرورت ہے۔ فی الوقت اقبال اکیڈیمی کا مالی موقف کسی لائبریرین کے تقرر کا متحمل نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک اہم ضرورت ہے جس کی تکمیل مستقبل قریب میں ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ کتابوں کے تحفظ جلد بندی اور الماریوں کے لیے خاصا مالیہ درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے شعبۂ اقبالیات کے دیگر فنون پر کتابوں کا حصول فی الوقت ملتوی رکھا گیا ہے۔ اگرچہ کہ مزید کتابوں کا بہ شکل عطیہ حصول دشوار نہیں ہے۔ مناسب جگہ کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ اقبال اکیڈیمی کے بڑھتے ہوئے کام کا تقاضا ہے کہ اقبال اکیڈیمی کے کتب خانہ، آفس اور ہال کے لیے کسی موزوں عمارت کی تعمیر کے منصوبہ کے پر عمل آوری کے لیے مستقبلِ قریب میں اللہ کا نام لے کر اقدام کرنا ہوگا۔

• شعبۂ اقبالیات کی تفصیل :- راست اقبالیات ۶۰۰، خصوصی نمبرات اور پاکستانی جرائد ۴۰۰
ایسی کتابیں جس میں اقبال پر مضامین ہیں ۱۰۰، ایسے رسائل جن میں اقبال پر مضامین ہیں ۳۰۰

• اشاعتی پروگرام :— اس عرصہ میں عالمی اقبال سیمینار کے مقالات اور پروفیسر صلاح الدین کے مقالات پر مشتمل دو کتابیں شائع کی گئیں۔ اقبال کی حیات اور شاعری پر جناب شاہ محی الدین کی تصنیف کردہ کتاب بھی شائع ہوئی۔ اس تلگو کتاب کی طباعت کے مصارف فاضل مصنف نے برداشت کیے جس کے لیے اکیڈیمی جناب شاہ محی الدین صاحب کی ممنون ہے۔ ایک اور کتاب IQBAL - EAST & WEST کی اشاعت کے کام کا آغاز کر دیا گیا ہے جس کی ٹائپ سٹنگ مکمل ہو گئی ہے۔ یہ مقالات پروفیسر انامیری شمل کی صدارت میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں پڑھے گئے تھے۔ اقبال اکیڈیمی کی کوششوں سے بعض مشاہیر حیدرآباد کے نام اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے۔ ضروری تعلیقات کے ساتھ مکاتیبِ اقبال کی اشاعت بھی پیش نظر ہے۔ ایک اور کتابچہ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد مشاہیر کی نظر میں زیر ترتیب ہے جس میں ان مختلف ماہرینِ اقبالیات اور اسکالرس کی کتاب الرائے میں درج آراء کا انتخاب شامل ہوگا جس میں مختلف ممالک کے اسکالرس بھی شامل ہیں۔ اس میں اقبال اکیڈیمی کا تعارف اور سرگرمیوں کی ایک مختصر رپورٹ بھی شامل ہوگی۔ یہ کتابچہ اندرون اور بیرون ملک اقبال اکیڈیمی کے تعارف کے لیے ہمدردوں کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ یہاں اس بات کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ اقبال اکیڈیمی کی مطبوعات انفرادی کوشش سے قلیل تعداد میں بھی فروخت ہو پاتی ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں کی لائبریریوں، علمی اداروں اور شخصیتوں تک کتابوں کو پہنچانے اور زر تعاون حاصل کرنے کے لیے کسی مستقل انتظام کی ضرورت ہے۔

• نئی نسل کے لیے اقبال اکیڈیمی کا پروگرام :— پہلے اجلاس میں نئی نسل کے لیے اقبال اکیڈیمی کے پروگرام کو منظوری دی گئی تھی جس کا مقصد نئی نسل کو نہ صرف پیام اقبال سے واقف کروانا ہے بلکہ طلبار و طالبات کی تحریری و تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، اُن میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنا، اور اپنے مذہبی اور تہذیبی ورثہ سے آگاہ کرنا ہے۔ نئی نسل کی ذہنی تربیت کے لیے یہ پروگرام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال اکیڈیمی کی جانب سے مملہ واری سطح اور تعلیمی مراکز میں بزم اقبال کے قیام کے لیے اپیل جاری کی گئی تھی۔ اقبال اکیڈیمی کی

ترغیب پر درشہوار گرلز ہائی اسکول دبیر پورہ، نیو لولی نلاورس ہائی اسکول مادناپیٹھ اور آدمس ہائی اسکول کالاڈیرہ ملک پیٹھ کے انتظامیہ نے اپنے تعلیمی مراکز میں بزم اقبال کا قیام عمل میں لایا ہے جس کے لیے اقبال اکیڈیمی ان کی ممنون ہے. توقع کی جاتی ہے کہ نہ صرف ان مراکز میں بلکہ اور مقامات پر بھی مستقل انداز میں اس کام کو جاری رکھا جائے گا۔

سنہ ۱۹۹۲ء میں اسکولس کے طلباء و طالبات میں کلام اقبال سے دلچسپی پیدا کرنے کے مقصد کے تحت خوش الحانی سے کلام اقبال پڑھنے کے مقابلے رکھے گئے۔ طلبا اور طالبات کیلئے علیحدہ علیحدہ مقابلے رکھے گئے اور ہر گروپ میں پرائمری اپر پرائمری اور ہائی اسکول کی سطح کے طلباء و طالبات کے علیحدہ گروپس تشکیل دیے گئے۔ ان مقابلوں کے ہر گروپ میں اول، دوم اور سوم مقام حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو نقد انعامات کے علاوہ ترغیبی انعامات بھی دیے گئے۔ یہ مقابلے توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہے۔ چنانچہ (58) طلباء اور (131) طالبات نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ ہر ایک کو ایک خوب صورت صداقت نامہ بھی مقابلہ میں حصہ لینے پر حوصلہ افزائی کے لیے دیا گیا۔ سرپرستوں اور اساتذہ کی کثیر تعداد نے بھی اس موقع پر شرکت کی۔ نئی نسل کے اس پروگرام اور مقابلوں کے انچارج جناب وہاج الدین شریک معتمد ہیں جن کی دلچسپی اور محنت قابل تحسین ہے۔ امید ہے کہ معزز اراکین اور ہمدردوں کے تعاون سے وہ اس اہم پروگرام کو آگے بڑھائیں گے۔

محترم جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب کی یہ خواہش تھی کہ اقبال اکیڈیمی نئی نسل کی جانب خصوصی توجہ دے اس سلسلہ میں ایک اور بات عرض کرنی ہے وہ یہ کہ نئی نسل تک اقبال اور ان کے پیام کو پہنچانے کے لیے آسان اور سلیس انداز میں کتابوں کی تیاری اور اشاعت پر کئی لوگوں نے توجہ دلائی ہے۔ ایسے لٹریچر کو مقامی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی پیش کرنے کے لیے منتظم کو کوشش کرنی ہوگی۔

معزز اراکین

یہ تھا اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیوں کا ایک نہایت اجمالی خاکہ۔ میں نے عمداً تفصیلات

سے گریز کیا ہے۔ لیکن اس خاکہ کی روشنی میں ہمیں آئندہ اپنے لائحہ عمل کا تعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اقبال اکیڈیمی بلند بانگ دعوے نہیں کرنا چاہتی اُسے اپنے حدود کا پاس اور لحاظ ہے لیکن موجودہ ذہنی اضطراب کی دور میں اور جذباتی ہیجان اور دھچکوں کی فضاء میں کوئی ادیب شاعر، اہلِ فکر و دانش اپنے ماحول سے بے تعلق اور بے گانہ نہیں رہ سکتا۔ اقبال کی فکر سے بصیرت اور اس کی پُرسوز شاعری سے حرارت حاصل کرتے ہوئے علمی اور فکری سطح پر کچھ خدمت انجام دے جاسکتی ہے تاکہ کچھ ایسے افراد تیار ہوں جو اپنے معاشرہ میں اقبال کی دانشِ نورانی کے امین بن سکیں۔

مجھے قوی توقع ہے کہ اکیڈیمی کے نئے صدر پروفیسر سراج الدین کی دل نواز اور شفیق شخصیت نئے لوگوں کو اپنے اور اکیڈیمی کے دائرہ کشش میں کھینچ لائے گی اور تقسیم کار کے اُصول پر ہم بھی کچھ ذمہ داری قبول کرتے ہوئے آمادۂ عمل ہوں گے۔

○○

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے ماہانہ اجتماعات

جون ۱۹۹۰ء تا دسمبر ۱۹۹۰ء

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ہر ماہ اہم موضوعات پر اجتماعات منعقد ہوتے ہیں نہ صرف اقبالیات بلکہ حالات حاضرہ اور اہم مسائل پر غور و فکر اور اظہارِ خیال کے لیے مختلف مکاتیبِ فکر رکھنے والے اہلِ علم کو مدعو کیا جاتا ہے۔ مجلس عاملہ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے طے کیا کہ اہم اجتماعات کی مختصر روئداد قارئین اقبال ریویو کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ اس شمارہ میں جون ۱۹۹۰ء تا دسمبر ۱۹۹۰ء منعقد ہونے والے چند اہم اجتماعات کی رپورٹس پیشِ خدمت ہیں۔ (ادارہ)

سمپوزیم: موجودہ عالمی نظریاتی تبدیلیاں

منعقدہ ۲۶ جون ۱۹۹۰ء

مقررین: جناب محمد ظہیر الدین احمد۔ ڈاکٹر یوسف اعظمی۔ پروفیسر سید علی نقی۔ جناب یم۔ ٹی۔ خاں

صدارت: پروفیسر سید سراج الدین

نوٹ: اس اجتماع کا انعقاد سوویٹ روس کے ٹوٹنے سے قبل میں آیا تھا۔

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام "موجودہ عالمی نظریاتی تبدیلیاں" کے موضوع پر ایک فکر انگیز سمپوزیم کا انعقاد سر نظامت جنگ ہال مدینہ منشن میں عمل آیا۔ پروفیسر سید سراج الدین نے صدارت کی۔ جناب مظہر لطیفی کی قرات کلام پاک سے کارروائی کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں کنوینر مجلس علمیہ اقبال اکیڈیمی علی ظہیر نے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اقبال اکیڈیمی کے فورم پر یہ خصوصیت رہی ہے کہ اہم موضوعات پر غیر جانبدارانہ اور معروضی تجزیہ کے لیے مختلف مکاتیب فکر کو مدعو کیا جاتا ہے۔

جناب محمد ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے مباحث کا آغاز کیا۔ انھوں نے گورباچیف کے پیش کردہ نظریات گلاسناسٹ اور پریسٹرائیکا کے محرکات اور نتائج کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ کمیونزم کے بنیادی نظریات اور ڈھانچہ میں اہم بنیادی تبدیلیوں کو رونما ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں جدلیاتی مادیت، تاریخ کی معاشی تعبیر کی بنیاد پر پرولتاری آمریت کے ذریعہ معاشی آسودگی جو خواب دیکھا گیا تھا وہ آج شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔ کمیونسٹ انٹرنیشنلزم کے فروغ کے لیے جو حکمت عملی اختیار کی گئی تھی وہ آج ناکام ہوگئی ہے۔ نہ صرف روسی وفاق بلکہ مشرقی و مغربی یورپ وسطی اور لاطینی امریکہ، افریقہ، یمن وغیرہ میں تبدیلیاں دور رس نتائج کی حامل ہیں۔ فکرِ اقبال کے حوالے سے جناب محمد ظہیر الدین احمد نے بتایا کہ جاوید نامہ میں افغانی کی زبانی ملت روسیہ کو جو پیام اقبال نے دیا تھا اس میں انھوں نے اس نقطہ نظر کا اظہار کیا تھا کہ روس کو مغرب کے مکر سے باخبر رہنا چاہیئے۔ اور اس کی تقدیر اقوام مشرق سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے میں ہے اور اسلام کی عالمگیر اور آفاقی اصولوں میں وہ توانائی میں موجود ہے جو مضطرب انسانیت کے ارضی اور روحانی تقاضوں کی تکمیل کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف اعظمی نے اپنی تجزیاتی تقریر میں، اکتوبر انقلاب، دو عظیم جنگوں، ایرانی انقلاب گلاسناسٹ اور پریسٹرائیکا کے موجودہ نظریات کے پس منظر میں بیسویں صدی کے ذہنی سفر کے اہم پہلوؤں کو واضح کیا۔ انھوں نے کہا کہ روسی قیادت کے موجودہ نظریات اور اقدامات کا مقصد انگھٹن کے احساس کو کم کرنا ہے۔ مصنوعی سرحدیں ٹوٹ رہی ہیں اور اس کے اثرات تیسری دنیا میں بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ موجودہ تبدیلیاں ایک نئی جہت کی آئینہ دار ہیں۔ ڈاکٹر اعظمی نے کہا آج بقائے باہم کی پالیسی انسانیت کو نیوکلیر ہتھیاروں سے نجات دلانے کی کوشش اور تنگ نظرانہ رجحانات سے گریز نئی صدی کے لیے ایک مثبت پہلو قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

پروفیسر دید علی نقی (امریکہ) نے اپنی تقریر میں امریکہ خارجہ پالیسی اور خصوصاً مشرقِ وسطیٰ اور ایران میں اس کے اثرات کا جائزہ لیا اور صیہونیت کے فریب کو واضح کیا۔

جناب ایم ٹی خاں نے اپنی تقریر میں سمپوزیم میں پیش کردہ بعض نقاطِ نظر کی وضاحت کرتے

ہوئے کہا کہ جدلیاتی مادیت کی سائنسی اساس، اب بھی بامعنیٰ ہے۔ البتہ تاریخی مادیت کا نظریہ کامیاب نہیں رہا۔ جناب یم ٹی خاں نے اس نقطہ نظر کا اظہار کیا کہ کمیونسٹ ممالک میں آزادی فکر اور اپنے تشخص پر اصرار کی لہر موجودہ نظریات کی پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ پچھلی چار دہائیوں سے اس لہر کو محسوس کیا جا تا رہا ہے۔ ان رجحانات کو سابق میں دبا دیا گیا تھا لیکن آج جمہوری نظام کی بحالی کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

پروفیسر سراج الدین نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا "تغیر" زندگی کی خصوصیت ہے۔ ہر دور میں نظریہ اور عمل میں مکمل آہنگی ممکن نہیں۔ کوئی آئیڈیالوجی جب ٹوٹتی ہے تو وہ ایسے نقوش چھوڑ جاتی ہے جو تاریخِ انسانی کا ایک جز اور میراث بن جاتی ہیں۔ پروفیسر سراج الدین نے فرمایا کہ آج گم رہی احساسات کے فروغ کا نتیجہ میں دہشت پسندی کی جو کیفیت رونما ہو رہی ہے وہ ایک خطرناک رجحان ہے اور سہولت کے ساتھ ہتھیاروں کے حصول نے اس مسئلہ کو اور سنگین بنا دیا ہے۔ فکرِ اقبال کے حوالہ سے صدرِ اجلاس بتایا کہ اقبال کے ہاں انسانیت کے کرب کا احساس ملتا ہے اور آج عالم گیر سطح پر اسلام ایک ابھرتا ہوا طرزِ فکر ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ وہ اپنی ہیئت اجتماعیہ میں کسی اور نظام سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔ پروفیسر سراج الدین نے فرمایا کہ آج کی نظریاتی تبدیلیاں تعمیری رجحانات کو ظاہر کر رہی ہیں اور خصوصاً مشرقی اور مغربی جرمنی کا اتحاد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

جناب خواجہ صدیق احمد، جناب کاشی ناتھ، جناب قدیر زماں کے علاوہ دیگر اصحاب نے بھی مباحث میں حصہ لیا۔ آخر میں جناب علی ظہیر نے شکریہ ادا کیا۔

۲۔ محفلِ اقبال: اقبال کی چند نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

منعقدہ ۲۲ جولائی ۱۹۹۰ء

مقررین / مقالہ نگار: جناب محمد ظہیر الدین احمد، جناب علی ظہیر، جناب مضطر مجاز

صدارت: پروفیسر سید سراج الدین

•

اقبال کی شاہکار نظم مسجدِ قرطبہ کی تشکیل حرکیاتی ہے جس کو بعض ناقدین کا بے روح اور

غیر مربوط نظم کہنا ظلم اور ناانصافی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سراج الدین نے اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقدہ محفل اقبال میں کیا۔ اقبال کی بعض نظموں کے تجزیاتی مطالعہ کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی اس محفل کا آغاز قاری حبیب اللہ صاحب کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ ابتدا میں جناب محمد ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈمی نے دو مختصر نظموں "اذان" اور "صبح" کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ اقبال کی معنی آفرینی کا یہ کمال ہے کہ مذہبی اصطلاحات کو بھی انہوں نے ایک نئی معنویت عطا کی ہے۔ عموماً ہماری نظریں حقیقت کے ظاہری پہلوؤں تک محدود تک رہتی ہیں لیکن اقبال کی شاعری کی وساطت سے ہم حقیقت کے اعلیٰ اور لطیف پہلوؤں سے روشناس ہوتے ہیں۔ 'اذان' اقبال کے نزدیک بیداری کی علامت اور ایک نئی سحر کے طلوع ہونے کی نوید ہے لیکن یہ وہ صبح نہیں جو ہر روز زمین کی گردش کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ وہ صبح ہے جو انسانیت کے لیے ایک نئی زندگی کی بشارت بنتی ہے۔ حضور ختمی مرتبتؐ کے لیے اقبال نے "صلوٰت صبح' بانگ اذان" کا استعارہ برتا ہے۔ چونکہ آپؐ کے بابرکت ظہور کے باعث تاریخ دنیا ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہوئی۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد نے اقبال کے اشعار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا مرد مومن کی اذان کا استعارہ بڑا بلیغ اور گہری رمزیت کا حامل ہے۔ "اذان بلالؓ کا ترانۂ عشق بھی ہے اور ندائے آفاق بھی جس سے دنیا کی عشاء اشراق میں بدل سکتی ہے۔ جاوید نامہ میں اقبال نے نادنِ نو کی ایک دلیل کے طور پر بھی پیش کیا ہے جہاں انسان زماں اور مکاں کے طلسم سے آزاد ہو جاتا ہے یا شکستِ عالم کے ذریعے زندگی کی ایک نئی صبح سے ہمکنار ہوتا ہے۔ جناب علی ظہیر نے اقبال کی شاہکار نظم مسجد قرطبہ کا ایک عمدہ تجزیہ پیش کیا۔ موصوف نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ اقبال کے بعض ناقدین نے اس نظم کے حسن اور خوبی کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اسے ایک غیر مربوط نظم کہنے ہے حالانکہ اس نظم کے تمام بند ایک اکائی میں ڈھل گئے ہیں جہاں خیال اور جذبہ کا مکمل ارتباط موجود ہے۔ اپنے اس نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے جناب علی ظہیر نے کہا کہ نظم کا پہلا بند وقت اور اس کے جلال کی عکاسی کرتا ہے جب کہ دوسرے بند میں جمال کی کیفیت کا اظہار

ہوا ہے۔ جلال اور جمال کی ان کی کیفیت کا امتزاج ہمیں مسجد قرطبہ اور خود شاعر کی ذات میں ملتا ہے جس کا تیسرے بند میں اظہار ہوتا ہے۔ جلال و جمال کی حامل شخصیت مردِ خدا کی ہے' مردِ خدا کی اس علامت کے آرکی ٹائپ کو اقبال مردِ مومن کی اصطلاح میں بیان کرتے ہیں جس کا دلکش عکس چوتھے اور پانچویں بند میں ملتا ہے۔ اس نظم کے چھٹے بند میں تاریخ میں مردِ خدا کے تخلیقی عمل کو بیان کیا گیا ہے جس کا اظہار ہسپانیہ کی سرزمین پر ہوا۔ صفاتِ جلال اور جمال کی حامل اس تہذیب کے بے روح ہو جانے کی وجہ سے جو اثرات یورپ پر مرتب ہوئے ان کا تذکرہ ساتویں بند میں کیا گیا ہے۔ یہ نظم آخری اور آٹھویں بند میں اپنے کلائیمکس کو پہنچ جاتی ہے جہاں موجودہ کرب اور اضطراب کے پس منظر میں ایک بشارت ملتی ہے ۔

آخر میں جناب مضطر مجاز نے بانگ درا کی ابتدائی نظم "حقیقت حسن" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مشہور شاعر ایلیٹ کے حوالہ سے بتایا کہ اس حسین نظم میں ڈرامائیت خود کلامی اور خطابت کے تینوں عناصر موجود ہیں جو ایک اعلیٰ شاعری کا خاصہ تسلیم کیے جاتے ہیں نظم کی تشریح کرتے ہوئے جناب مضطر مجاز نے کہا کہ یہاں حُسن کی عارضی کیفیت کا اظہار ہوا ہے اور اس نظم کے کردار قمر' اخترِ سحر' شبنم' کلی اور پھول وغیرہ ہیں جن پر آگے اقبال نے علحدہ نظمیں لکھی ہیں۔ اس طرح یہ فن پارہ اقبال کے شعری سفر میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فاضل تجزیہ نگار نے اس نقطۂ نظر کا اظہار کیا کہ اقبال کے کلام کی ایک بنیادی خصوصیت رجائیت ہے جس کے برعکس اس نظم میں حزن کا ایک احساس اُبھرتا ہے جب کہ حُسن کے زوال پذیر ہونے کے انکشاف پر" چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا" کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن زندگی کی بنیادی حقیقت تغیر اور تبدیلی ہے جس کا منطقی نتیجہ فنا اور زوال ہے۔ اقبال کی فکر میں بقا کی یہ تمنا عشق کا سہارا حاصل کر لیتی ہے جہاں مردِ خدا کے عمل میں جب وہ عشق سے فروغ پاتا ہے' ثبات کا ایک رنگ جھلکتا ہے۔

پیش کردہ نظموں کے تجزیاتی مطالعہ کے بعد مباحث میں جناب سکندر توفیق' جناب

شرافت علی اور ڈاکٹر یوسف اعظمی نے حصہ لیا اور اہم نکات کی طرف اشارہ کیا۔ اس محفل میں پیش کردہ تجزیوں پر اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر سراج الدین نے عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اذان جہاں ایک نئی صبح کی بشارت ہے وہیں صبح کے ضمیر سے پھوٹتی ہوئی یہ آواز صداقت کا اعلان بھی ہے۔ مسجد قرطبہ کے بارے میں پروفیسر سراج الدین نے فرمایا کہ اس نظم میں ایک تیز بہاؤ اور تحریک کی کیفیت ملتی ہے اس کے باوجود اس نظم کے بارے میں بعض اصحاب کا یہ خیال کہ یہ ایک غیر مربوط اور بے روح نظم ہے سراسر ظلم اور نا انصافی ہے۔ موصوف نے کہا بڑی شاعری ایک "حال" ہوتی ہے اور تنقید و تجزیہ قیل و قال کے ذریعہ حال کے لمحات کو گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔ بڑی شاعری میں گنجائش ہے کہ ہر عہد اور ہر دور اس میں اپنے آپ کو پا سکے۔ "مسجد قرطبہ" کے تجزیہ کے ضمن میں موصوف نے مزید کہا کہ اس نظم کے آغاز ہی میں ایک رَو کا سلسلہ ہے یہ زمانے کی رَو ہے جو ازل سے ابد تک بہتی چلی جاتی ہے۔ کرہ ارضی کے دائرہ مکانی میں داخل ہو کر یہ رَو تغیر اور ارتقا کا دھارا بن جاتی ہے جہاں تاریخ کے حوادث ظہور میں آتے ہیں اس طرح فکر اقبال کے کئی اجزا اس نظم میں یکجا ہو کر وحدت بن گئے ہیں اور اس نظم کی جمالیاتی اور ذہنی حرکت عمومیت سے تخصیص اور خصوصیت سے تعمیم کی طرف لوٹتی ہے۔
اس اثر انگیز محفل کا اختتام جناب علی ظہیر کنونیر مجلس علمیہ اقبال اکیڈیمی کے شکریہ پر عمل میں آیا۔

سمپوزیم : جدید سائنس، تکبّر سے انکسار تک

منعقدہ ۱۹ اگسٹ سنہ ۱۹۹۰ء

مقررین : جناب محمد ظہیر الدین احمد۔ جناب محمد عارف الدین۔ ڈاکٹر انیس الدین

صدارت : جناب عبدالرحیم قریشی

•

جدید سائنس کا انکسار، نارسائی کے احساس اور اپنے حدود کے عرفان کا نتیجہ ہے۔
۱۹ ویں صدی میں سائنس دانوں کا تکبّر اہل کلیسا کے محدود اور تنگ نظرانہ تصوّرات کا ردِ عمل

تھا جو سائنسی ترقی کا ساتھ نہ دے سکا اور آج جدید سائنس کے نظریات اور اُن کے نتائج کائنات کی روحانی تعبیر کی ضرورت کا احساس دلا رہے ہیں. ان خیالات کا اظہار مقررین نے "جدید سائنس. تکبر سے انکسار تک" کے موضوع پر منعقدہ ایک سمپوزیم میں کیا. اس سمپوزیم کا اقبال اکیڈیمی حیدرآباد اور اسلامک اکیڈیمی آف سائنس کی جانب سے ۱۹ اگسٹ کو مدینہ منشن نارائن گوڑہ پر کیا گیا تھا. جس کی صدارت جناب عبدالرحیم قریشی معتمد عمومی کل ہند مجلس تعمیر ملت نے کی. جناب حافظ سید حبیب اللہ کی قرآت کلام پاک کے بعد جناب محمد ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے مباحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ بدلتے ہوئے سائنسی نظریات کا جائزہ لینا اس لیئے ضروری ہے کہ مختلف ادوار میں سائنسی انکشافات کی بنیاد پر فلسفہ سائنس نے فطرت کے اصولوں کو انسانی زندگی پر لاگو کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً میکانکس کے اصولوں کے مطابق جہاں یہ بتایا گیا کہ کائنات ایک بندھے ٹکے قوانین کے مطابق چل رہی ہے، وہیں سماجی اداروں پر بھی اس اصول کو منطبق کرتے ہوئے انسان کی فاعلیت کو جبر اور تعیّن کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا. اسی طرح نظریہ ارتقار کی بنیاد پر پوری انسانی تاریخ کی مادی نقطہ نظر سے جدلیاتی تعبیر کی گئی. جناب محمد ظہیر الدین احمد نے کہا کہ ۱۹ ویں صدی میں سمجھا جانے لگا تھا کہ سائنس مذہب کے لیے ایک چیالنج بن رہی ہے اور یہ سمجھا جانے لگا انسانی عقل کائنات کی گتھی سلجھا سکے گی اور حیات کے راز کو ظاہر کر سکے گی. لیکن بیسویں صدی کے آغاز ہی سے جدید انکشافات نے کلاسیکی طبعیات کی کئی نظریات کو رد کر دیا اور آج سائنس تعیّن اور جبر سے نکل کر عدم تعیّن یا امکانات کی تلاش کی منزل پر آگئی ہے اور آج بعض ممتاز سائنس دانوں کی بھی یہ رائے ہے کہ علوم طبعیات کی ترقی ایسے نتائج کی طرف نشان دہی کر رہی ہے جو کائنات کی روحانی تعبیر کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں جس کا اظہار اقبالؒ نے آج سے ۶۰ سال پہلے اپنے خطبات میں کیا تھا۔

سالمیاتی اور خلیاتی سائنس سے متعلق والبتہ ادارہ سی سی ایم بی کے سینئر سائنٹسٹ جناب محمد عارف الدین نے اپنی تقریر میں کہا کہ قرآن مجید نے ذکر کے ساتھ فکر پر بھی زور دیا ہے. جو

بقول اقبال ایک ہی سالک کی جستجو کے مقامات ہیں ۔ تضاد اس وقت پیدا ہوتا ہے جب محدود مذہبی خیالات، سائنسی ترقی کا ساتھ نہ دے سکیں، جیسا کہ سابق میں اہل کلیسا کا ردعمل تھا لیکن سائنسی تفکر قرآنِ مجید کا فیضان ہے ۔ جناب عارف الدین نے جدید سائنس کے حوالے سے بتایا کہ زندگی کے اسرار کی توجیہہ سے کس طرح سائنس عاجز ہے ۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ سورج سے ہر سکنڈ جو توانائی خارج ہوتی ہے وہ دس لاکھ ایٹم بم کے برابر ہے ۔ لیکن زمین کے اطراف فضائی غلاف اس سے بے پناہ حرارت کو جذب کر کے زمین تک اتنی ہی حرارت پہنچاتے ہیں ۔ جو زندگی کی بقاء کے لیے ضروری ہے ۔ درختوں کے پتوں کے اندر موجود کلوروفل کئی لاکھ ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر کے اتنی ہی مقدار میں آکسیجن فراہم کرتے ہیں جس کے بغیر کوئی حیوان روئے زمین پر زندہ نہیں رہ سکتا ۔ ذوقِ نمو سے بھرپور ایک خلیہ کا مشاہدہ، اس کی ساخت اور بناوٹ اور فعلیت کے بارے میں ایسے حیرت انگیز انکشافات کو ظاہر کرتا ہے جس کی مادی توجیہہ نہیں کی جا سکتی ۔ اس طرح جدید سائنس سے حاصل ہونے والا علم بھی یہ یقین مضبوط کر رہا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے بے شمار مظاہر ایک قادرِ مطلق اور عظیم خالق کے وجود کی دلیل ہیں ۔

ڈاکٹر انیس الدین صدر اسلامک اکیڈیمی آف سائنس نے پچھلے دس برسوں میں جدید سائنس اور فلسفہ سائنس پر شائع ہونے والی مختلف کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا کہ سائنس دانوں کی ریاضیاتی تشریح کے مطابق کائنات کا آغاز ایک نقطۂ موہوم سے ہوا ۔ جس کو ہم عدم کہتے ہیں ۔ اس طرح عدم آج ایک طبیعیاتی حقیقت ہے ۔ کائنات کے اندر کارفرما وحدت، ہم آہنگی کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک برقیہ اصولاً پوری کائنات کے نظام سے مربوط ہے ۔ ڈاکٹر انیس نے کہا

اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ شعور خود مادّہ کی ترقی کا ایک کرشمہ ہے تو نہ صرف یہ شعور کی آزاد فعالیت کا انکار ہے بلکہ اس سے ہماری حاصل کردہ معلومات پر حرف آتا ہے ۔ چونکہ یہ علم، شعور کی ہی کی ترتیب اور تنظیم کا نام ہے انھوں نے بعض جدید نظریات کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ نور کائنات کی بنیادی حقیقت ہے جو ساری کائنات کے اندر جاری اور اُسے مربوط کئے ہوئے ہے ۔ آخر میں

انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ حقیقت اصل میں ایک ہی ہے لیکن اس کی تعبیر میں صرف فرق اس لیے پڑتا ہے کہ ہم مختلف زاویوں سے اس کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔

ممتاز ماہر چشم ڈاکٹر یوسف حسین نے سمپوزیم میں پیش کردہ مختلف نکات کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'تغیر' کائنات کی ایک بنیادی حقیقت ہے اور علم فطرت کوئی ساکن شے نہیں بلکہ ہر آن حوادث کی ایک نئی ترکیب اور تخلیقی حرکت ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین نے بتایا کہ جدید دور میں علم بصریات میں بھی بنیادی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور آج حیاتیاتی بصریات اہمیت کر گئی ہیں جو ہمیں بصارت سے بصیرت تک لے جاتی ہیں۔ جناب قدیر زماں نے بھی مباحث میں حصہ لیا۔

جناب عبدالرحیم قریشی نے اپنی صدارتی تقریر میں سائینس اور مذہب کے درمیان ہم آہنگی پر زور دیا جس کا فقدان دوہری شخصیت کو جنم دیتا ہے اور ایک سائینس داں یا فلسفی بھی توہمات کا شکار ہو جاتا ہے جس کی انھوں نے مثالیں دیں۔ انھوں نے کہا کہ سائینسی انکشافات کے ایک دور میں سائینس دانوں میں ایک تکبّر کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ مخصوص حالات کا ردعمل تھا، لیکن آج عرفانِ نفس اور نارسائی کے احساس نے انکسار کی طرف مائل کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا تکبّر اور انکسار دونوں میں مشترک چیز علم ہی ہے لیکن فرق اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ برتنے کا انداز فکر مختلف ہو جاتا ہے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے بتایا کہ بعد کے انکشافات کی روشنی میں ایک مخصوص فلسفہ کو مسلط کرنے کے لیے ڈارون کے نظریہ ارتقا کی تائید میں جو ثبوت پیش کیے گئے ہیں وہ غلط ثابت ہوئے۔

جناب سید تمیم معتمد اسلامک اکیڈیمی آف سائینس کے شکریہ پر یہ فکر انگیز محفل اختتام کو پہنچی۔

۴۔ توسیعی تقریر: ابنِ خلدون اور اقبال عہدِ زوال کے عبقری

منعقدہ ۲۵ نومبر ۱۹۹۰ء

مقرر: جناب محمد طارق غازی صدارت: پروفیسر سراج الدین

•

ابن خلدون اور اقبال دونوں عہد زوال کے عبقری (جینیس) ہیں۔ عروج کے زمانہ

کے برعکس زوال کے دور میں ایسے صاحب نظر کو وسیع فکری عمل سے گزرنا پڑتا ہے جتنی بڑی قوم اس کے سامنے اور جتنی عظیم تہذیب رفتہ اس کے پیچھے ہوگی، اتنا ہی قوی مظاہرہ اس کے اجتہادی، تجریدی، اور ایجادی صلاحیتوں کا ہوگا۔ اس اعتبار سے دونوں کے پیش نظر منصب سے اتری ہوئی ایک قوم کو دوبارہ ارتقاء کے راستہ پر گامزن کرنے کا سوال درپیش تھا۔ ان خیالات کا اظہار جناب محمد طارق غازی منیجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ نے "ابن خلدون اور اقبال۔ عہدِ زوال کے عبقری" کے موضوع پر اپنے توسیعی لکچر میں کیا۔ اس محفل کا انعقاد اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام مدینہ منشن ناراین پر عمل میں آیا۔ کاروائی کا آغاز جناب قاری حبیب اللہ کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ پروفیسر سراج الدین نے صدارت فرمائی۔ ابتدائیں ڈاکٹر یوسف اعظمی نے اپنی تعارفی اور خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ جناب طارق غازی ایک ایسے گھرانہ کے چشم و چراغ ہیں جو علم و ادب کے میدان میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ وہ باصلاحیت صحافی کے علاوہ شاعر اور نقاد بھی ہیں۔ جناب علی ظہیر معتمد مجلس علمیہ اقبال اکیڈیمی نے ابن خلدون اور اس کے عہد کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کیں۔ جناب طارق غازی نے اپنے پرمغز اور فکر انگیز مقالہ میں ابن خلدون اور اقبال کے نظریات کے درمیان فرق اور فکری ہم آہنگی کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ ابن خلدون نے مستقبل سازی کے اندازے قائم کرنے کے لیے معاشرہ کے مطالعہ پر زور دیا ہے جب کہ اقبال فرد کے واسطے سے معاشرہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ارتقائے اولین کے طور پر ابن خلدون نے 'عصبیت' کا نظریہ پیش کیا۔ لیکن یہ لفظ ان منفی معنی میں نہیں برتا گیا جیسا کہ عام طور پر اس کا مفہوم سمجھا جاتا ہے بلکہ ابن خلدون نے اس لفظ کو ایک اصطلاح کے طور پر برتا ہے جو ایک ایسی نفسی اور ذہنی قوت ہے جو کسی قوم کے جذبہ عمل کو ابھارتی ہے۔ اقبال نے نظریہ خودی کی وکالت کی ہے ان دو اصطلاحوں کا تقابلی بلکہ توازنی مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ ان دو مفکروں کے باہمی ربط کا اشارہ نظریۂ حرکی عمرانیات سے ملتا ہے۔ اقبال کی شاہکار نظم مسجد قرطبہ اسی نظریۂ حرکی عمرانیات کی عمدہ مثال ہے۔ حیاتِ اجتماعی کے مطالعہ میں ابن خلدون کو تین حالتوں کا سراغ ملتا ہے۔ پہلی حالت بداوت

جو جفاکشی، سادہ زندگی، فقر و استغناء سے عبارت ہے۔ دوسری حالت حرب و فتح کی ہے جو تہذیب کی سمت پیش قدمی ہے اور تیسری حالت حضارت یعنی تہذیب و تمدن کا دور ہے۔ اقبال نے بھی کہا کہ فطرت کے مقاصد کی نگہبانی، بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔ اقبال نے فقر میں اسرارِ جہانگیری کی کھوج کی ہے۔ ابن خلدون نے حرکی عمرانیات کی علمی اور عقلی تشریح پر اکتفاء کیا ہے۔ جب کہ اقبال نے اسے بداوتِ فکر سے مملو کر کے ایک ایسا پیغام بنا دیا ہے جو عمل کے لیے نقطہ آغاز بن سکتا ہے۔ جناب محمد طارق نے اس نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ حرکی عمرانیات ایک قرآنی اصول ہے جس کی رُو سے انسان ایک ایسا معاشرہ بنانے کا مکلّف ہے جس کے سب وظائف مکمل ہوں۔ خلدونی فلسفہ کا ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ شکست و ریخت اور حالت انتشار میں معاشرتی ترقی اور انحطاط کے اصل قوانین پر نظر کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور یوں وہ مذہب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اس اعلیٰ اور فکر انگیز مقالہ میں پیش کردہ نکات پر مباحث میں محمد ظہیر الدین، جناب خواجہ صدیق احمد، جناب زاہد محی الدین، ڈاکٹر یوسف اعظمی، جناب لیس ام شرافت علی کے علاوہ جناب عبدالرحیم قریشی معتمد عمومی کل ہند مجلس تعمیر ملت نے بھی حصہ لیا۔

پروفیسر سراج الدین نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا یہ محفل وقیع اور فکر انگیز مقالہ اور اس پر معیاری مباحث کے اعتبار سے بڑی اہم رہی۔ انھوں نے کہا کہ ابن خلدون کا مقدمہ عمرانی علوم کے مبسوط مطالعہ کا آغاز ہے۔ جہاں تاریخ محض وقائع نگاری نہیں بلکہ تاریخ کے پیچھے کارفرما عوامل کی کھوج بن جاتی ہے۔ پروفیسر سراج الدین نے کہا کہ ابن خلدون اور اقبال جداگانہ زمانہ اور مختلف حالات کے آفریدہ ہیں۔ اس لیے ان کی اصطلاحوں میں عصریت کے فرق کے باوجود ان کے درمیان فکری ہم آہنگی کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ اقبال کی اصطلاح عشق میں بھی جوشِ حیات کے معنی مضمر ہیں جو ابن خلدون کی نظریہ عصبیت سے ذہنی قرب رکھتی ہے۔

جناب علی ظہیر کے شکریہ پر اس محفل کا اختتام عمل میں آیا۔

۵۔ سمپوزیم : سرسید سے اقبال تک، ارتقائے فکر و نظر

منعقدہ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۹۰ء

مقررین : جناب محمد ظہیر الدین احمد۔ ڈاکٹر عبدالقادر عمادی۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی

صدارت : پروفیسر منظور عالم

•

ہندوستان میں تعلیمی بیداری کی تحریک اور اس کے وسیع اثرات سرسید کی دین ہیں۔ انھوں نے یہ احساس دلایا ہندوستانی مسلمان علوم جدید اور خصوصاً سائنس میں مہارت پیدا کرتے ہوئے اپنی پستی کو ترقی میں بدل سکتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر منظور عالم سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے منعقدہ مذاکرہ میں کیا۔ "سرسید سے اقبال تک۔ ارتقائے فکر و نظر" کے موضوع پر اس مذاکرہ کا انعقاد ۲۱ر اکتوبر کو اقبال اکیڈیمی مدینہ منشن میں عمل میں آیا۔ کاروائی کا آغاز قاری سید حبیب اللہ کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ جناب سید رضی اللہ حسینی نے اقبال کی نظم "سرسید کی لوحِ تربت" سنائی۔ ابتدا میں جناب علی ظہیر معتمد مجلس علمیہ اقبال اکیڈیمی نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ ان دو عظیم شخصیتوں نے جو فکری سرمایہ چھوڑا ہے وہ مستقبل میں ہمارے ملّی سفر کے لیے شعل راہ ہے۔ مذہبی فکر کے پہلو پر جناب محمد ظہیر الدین احمد کی تقریر سے مباحث کا آغاز ہوا۔ انھوں نے سرسید کے مذہبی افکار کے محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ اپنے دور کے تقاضوں اور چیالنج کے پیشِ نظر سرسید کا مقصد اسلام کی صداقتوں کو معقولی انداز میں پیش کرنا تھا۔ لیکن سرسید کے پیشِ نظر یہ مفروضہ تھا کہ اسلام اور عالم فطرت مماثل ہیں۔ فطرت کا مفہوم ان کے نزدیک اس وقت کے سائنسی نظریہ کے مطابق تھا جس کو ناقابلِ تغیر قوانین کا پابند سمجھا گیا۔ اس منہاج فکر نے تاویل اور تعبیر کے راستہ میں دشواریاں پیدا کیں۔ سرسید کے مقابلہ میں اقبال مغرب سے زیادہ باخبر تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کس طرح موجودہ تمدن کو اسلام کے قریب کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقادر عمادی نے سماجی پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ سرسید کی

بصیرت نوشتۂ دیوار کو پڑھ سکتی تھی ۔ انھوں نے اپنے دور کے نازک حالات میں اس بات کو سمجھایا کہ مغرب کے سیاسی اور تہذیبی غلبہ کے پیچھے دراصل علوم جدیدہ کی قوت کارفرما ہے اس لیے مسلمانوں کو بھی علم و حکمت سے بہرہ ور ہونا چاہیئے ۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہمارا یہ فرض ہے کہ سرسید اور اقبال پر رُک نہ جائیں بلکہ اس کاروانِ فکر کو جاری رکھیں ـــ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے اپنے مضمون میں بتایا کہ سرسید تحریک نے نثری وسیلۂ اظہار پر زور دیا ہے ۔ چنانچہ نذیر احمد نے اپنے ناول میں ہندوستان کی معاشی پسماندگی اور ان کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ۔ حالی کی نظم "حبِّ وطن" ۱۸۷۸ء میں بنکم چندر کے وندے ماترم (آنند مٹھ) سے چار سال قبل لکھی گئی تھی ۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کے زیرِ اثر حالی اور نذیر احمد نے تعلیمِ نسواں پر زور دیا ۔ مذاکرہ میں پیش کردہ نکات پر ڈاکٹر یوسف اعظمی، جناب خواجہ صدیق احمد، جناب مصطفیٰ شروانی، ڈاکٹر سلطان عمر، جناب خواجہ نامر الدین، جناب دانش اقبال کے علاوہ جناب طارق غازی مینجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ نے مباحث میں حصہ لیا ۔ ان اصحاب نے سرسید سے اقبال تک ذہنی سفر میں بعض اہم شخصیتوں اور رجحانات کی نشان دہی کی ۔ پروفیسر منظور عالم سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ سرسید اور اقبال دونوں اسلامی ہند کے فکری سفر میں اہم مقام رکھتے ہیں ۔ ان کے افکار کے تجزیہ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس دور کے حالات اور پس منظر کو بھی سمجھیں ۔ اور ان کے درمیان معنوی ربط کی تلاش کریں ۔ سرسید کے افکار ہندوستان کے چوکھٹے میں اہمیت رکھتے ہیں جب کہ اقبال کے پیشِ نظر عالمی حالات اور عالم اسلام کا اضطراب تھا ۔ لیکن دونوں کے ہاں مستقبل کے اکتشاف کی کیفیت ملتی ہے ۔

جناب کریم رضا معتمد اقبال اکیڈیمی نے مذاکرہ کی کاروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا ۔

○○

سیّد خلیل اللہ حسینی

پیامِ اقبال

سرزمین ہند کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اقبال جیسے عظیم فن کار کو جنم دیا۔ یہ صحیح ہے کہ بعد میں ہند کا وہ علاقہ جہاں اقبال پیدا ہوئے اور وہ شہر جہاں ان کا انتقال ہوا، پاکستان میں شامل ہو گیا۔ لیکن کہنا چاہیے کہ اقبال کی ساری زندگی ہندوستان ہی میں بسر ہوئی اور ان کا انتقال ۱۹۳۸ء میں لاہور میں ہوا۔ اور اس کے کوئی (۹) سال کے بعد پاکستان بنا۔ اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال اسی سرزمین کے ہیں۔ اقبال پر اہلِ پاکستان کا حق ہو گا لیکن حق مالکانہ نہیں جس کا اظہار ہوتا رہتا ہے اور شرما حضوری میں ہندوستانیوں کا یہ حال ہے کہ

ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم

اہل پاکستان اقبال کو لے اڑے اور ہم ہندوستانی دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس کی بہت سے وجوہات تھیں کہ ہندوستانیوں نے اقبال کا نام لینے سے احتیاط کی۔ لیکن اب وقت ہے کہ پوری جرأت کے ساتھ یہ کہہ دیا جائے کہ اقبال پر ہمارا بھی حق ہے اور ہم اقبال کے متعلق کچھ کرنے کی سکت رکھتے ہیں۔

اقبال دوستی کا رجحان اگر ہندوستان میں عام ہو جائے تو ان لوگوں کے چہروں پر طمانچہ پڑے گا جو فرقہ پرست ہیں اور جو مسلم دشمنی میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ بہت خوش ہیں کہ اقبال جلاوطن ہو گیا۔ ان فرقہ پرست جماعتوں کی مساعی کو ناکام بنانے کے سلسلہ میں اقبال دوستی بھی اہم عنصر ہو گی۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں دنیا کی سب سے امید افزا

کتاب یعنی قرآن کریم کا اثر اور دنیا کے لیے جو پیام رحمت ہے اس کی سیرت کی چھاپ ملے گی ۔ لیکن اسلام کا یہ اثر جو کلامِ اقبال میں جھلکتا ہے کوئی تنگ نظرانہ پیام نہیں ہے وہ سارے انسانیت کے لیے پیام عمل ہے۔ محکوم قوم کی حالتِ زار پر جو آنسو انہوں نے بہائے ہیں اور حاکم قوموں کی چیرہ دستیوں کا جو تذکرہ انہوں نے کیا ہے مغربی استعمار کی چنگیزیت کا جو بیان انھوں نے کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ استعماریت اور سامراجیت کے خلاف اقبال نے جو جہاد کیا ہے اور جس طرح سینہ سپر ہوئے اس کی نظیر نہیں ملتی ۔

یوں تو بہت سے شعرا ہیں جو وطن کی آزادی کے لیے مضطرب نظر آتے ہیں لیکن یہ لوگ چاہے کتنے بڑے ہوں۔ وطن کے تعلق سے متفکر نظر آتے ہیں ۔ اقبال نے اہل وطن کو جو پیام آزادی دیا اس میں وہ متفکر نہیں بلکہ مفکر نظر آتے ہیں اور ان کا مفکر ہونا ہی ان کی بڑی خوبی ہے جس میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ۔

اقبال کے زمانے میں یورپ سے آئی ہوئی قوم یعنی انگریز ہندوستان کے حاکم تھے ۔ اہلِ ہند بے چارگی کا شکار تھے ۔ اقبال نے اس غلامانہ ذہنیت کے خلاف ایک محاذ بنایا اور جو کچھ انہوں نے غلامانہ ذہنیت کے خلاف لکھا وہ ادب کی دنیا میں حرفِ آخر ہے ۔ غلاموں کی نفسیات اور نفسیاتِ غلامی پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے شاید اس میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتا ۔ اس سلسلہ میں ان کے اشعار قابلِ توجہ ہیں ۔

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

ایک قبر میں ایک مردہ دفن ہوتا ہے، قبر کہتی ہے کہ کیا بات ہے کہ تیری خاک بڑی

سوزناک ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو دنیا میں بندہ محکوم تھا' تب ہی تو تیری خاک اتنی سوزناک ہے۔ اقبال کے یہ خیالات جس میں انہوں نے سامراجیت کے خلاف جہاد کیا اور غلامی کی نفسیات کے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ بہتر ہوگا اگر ہم یاد رکھیں۔ "شعاع اُمید" اقبال کی ایک مشہور نظم ہے جس میں امید کی شعاع کا یہ کہنا قابلِ غور ہے کہ

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خوابِ سے مردانِ گراں خواب

اقبال نے یہ باتیں اپنے زمانے کی یورپ کی طاقتوں کے لیے لکھی تھیں' اب یورپ کی بجائے خود ہمارے ہی ملک میں متشرکانہ قوتیں ہیں جو توحید پرستوں کی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ باطل کی حفاظت کا کام اس زمانے میں یورپ کیا کرتا تھا' اب یہی کام ہمارے دیش میں فرقہ پرست قوتیں کر رہی ہیں۔ اگر ہم کو انصاف سے محبت ہے' ظلم سے نفرت ہے' مساوات انسانی کی طرفداری کرتے ہیں اور انسان میں اونچ نیچ کی مخالفت کرتے ہیں تو پھر ہم سب کو پیامِ اقبال کی نشر و اشاعت میں سمینار اور سمپوزیم کے ذریعہ' جلسوں اور تقاریر کے ذریعے پوری طور پر مصروف ہو جانا چاہیئے۔ خود اقبال کے الفاظ میں:

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی ❊ اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

اصل میں یہ ڈر ہی ہوتا ہے جو ان کوششوں کا دشمن ہوتا ہے جو ظلم کے خلاف ہم کرنا چاہتے ہیں۔ ڈر ہی بہت سی سماجی بیماریوں کی جڑ ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کو بے خوف بنایا اور کلمۂ طیبہ کا ورد کروا کر اس کائنات میں انسان کو صرف خدا کا تابع رکھا اور ساری دنیا سے بے خوف کر دیا۔

اقبال نے بھی بے خوفی اور جراءت پر بہت زور دیا ہے۔ اقبال دوستوں کا یہ کام ہے کہ پوری جرأت اور جواں مندی کے ساتھ اقبال کے اس پیامِ انسانیت نواز کو عام کرنے کی کوشش کریں۔

مجھے یقین ہے کہ ان کوششوں کی وجہ سے شیطان پریشان ہوگا اور خدائے کائنات

کے چہرے پر مسکراہٹ آئے گی. ہمیں شیطان کی خفگی کی پرواہ نہ کرنا چاہیے، بلکہ ربِّ ذوالجلال کی رحمت کا امیدوار چاہیئے کہ خدا کے چہرے پر آئی ہوئی مسکراہٹ انسانیت کی مصیبتوں کا مداوا ہے. بقول اقبال

اور یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں امیر

میرے قافلہ میں لٹنے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

(اقبال سمینار منعقدہ ۱۹۸۴ء کے لیے پیام)

●●

مولانا سلیمان سکندر
صدر کل ہند مجلس تعمیرِ ملّت

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من

اقبال اکیڈیمی حیدر آباد جو گذشتہ کوئی تین دہائیوں سے ہندوستان کے علمی، تہذیبی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت سے کام کر رہی ہے اور جس کا اس وقت پھیلاؤ حیدر آباد سے باہر بھی دور دراز تک نظر آتا ہے، اپنے بانی صدر کل ہند مجلسِ تعمیرِ ملّت کی رہنمائی اور رہبری میں کام کرتے آرہی تھی کہ ۵ر ڈسمبر ۱۹۹۳ء کو قاید محترم جناب سیّد خلیل اللہ حسینی اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رحلت کر گئے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد زعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مرحوم و مغفور حضرت سید خلیل اللہ حسینی صاحب کی یاد تو عاشقانِ اقبال کو مسلسل تڑپاتی رہے گی۔ مگر اس تڑپ کی کوکھ سے انشاء اللہ نئے نئے سوتے پھوٹتے رہیں گے اور اقبال اکیڈیمی حیدر آباد کا کارواں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہے گا اور اپنے بانی کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرتا جائے گا۔

گذشتہ برسوں میں اکیڈیمی کے یوں تو بہت سے کارہائے نمایاں سامنے آئے ہیں مگر اس کا ایک اہم کارنامہ اقبال ریویو کی اشاعت ہے۔ یہ سلسلہ درمیان میں کچھ رُک گیا تھا مگر اب پھر سے یہ پرچہ منصۂ شہود پہ جلوہ گر ہوا ہے۔ اکیڈیمی کے نئے صدر محترم پروفیسر سراج الدین صاحب اور قدیم رفیق کار جن کو اکیڈیمی میں ایک

تاسیسی حیثیت حاصل ہے گرامی قدر جناب محمد ظہیر الدین احمد صاحب نائب صدر اقبال اکیڈیمی اور دیگر رفقاء سے بھرپور توقعات وابستہ ہیں کہ اکیڈیمی کے ذریعہ پیام اقبال کئی نئی نسلوں تک رسائی ہوتی رہے گی۔ بہار کے دور آتے رہیں گے اور علم و ادب کی دنیا اپنی پیاس بجھاتی رہے گی مگر ضرورت ہے کہ شمع کے پروانے روشنی کی کرنوں کو رگِ سنگ تک پہنچانے کا سامان کریں، اس کے لیے دامے درمے سخنے قدم اٹھائے جائیں اور اکیڈیمی کی بنیادوں کو مستحکم سے مستحکم تر کیا جائے۔

آخر میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جاسکتا کہ اس نصف صدی میں کل ہند مجلس تعمیرِ ملّت نے قوم کو کئی صورتوں میں جہاں بہت کچھ دیا ہے وہیں اقبال اکیڈیمی بھی اس کے بانی کی ایک بڑی اہم دین ہے، کیونکہ قرآنِ مجید اور سیرتِ طیبہ کے ابدی سرچشموں سے مستنیر اقبال کی دانشِ نورانی ہمیں موجودہ دور کی اضطرابی کروٹوں میں بہتر مستقبل کی راہ سجھاتی اور اس کے حصول کے لیئے عزم اور حوصلہ عطا کرتی ہے۔

مخلص

سلیمان سکندر

صدر کل ہند مجلس تعمیرِ ملّت

★

تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

★

چو سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم
تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

مکرمی۔ تسلیم

اقبال ریویو کا دوبارہ اجراء عمل میں آچکا ہے۔ اس پرچے کی اہمیت وافادیت آپ پر واضح ہے۔ اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ اقبال ریویو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پابندی سے شائع ہوتا رہے۔ فی الحال سال میں دو شمارے پیش کئے جائیں گے، لیکن اس کا انحصار آپ کے تعاون پر ہے۔ براہِ کرم اقبال ریویو کا سالانہ خریدار بن کر ایک اہم ضرورت کو پورا کیجئے۔

دو شماروں کے لئے زرِ تعاون 50 روپئے سکہ ہند اور بیرونی ممالک کیلئے 8 ڈالر (یا مساوی رقم) مقرر کیا گیا ہے۔ رقومات بذریعہ ڈاک یا چک روانہ کی جاسکتی ہیں۔ خریدی کارڈ منسلک ہے۔

مزید درخواست ہے کہ آں جناب اپنے احباب کو بھی متوجہ فرمائیں فقط

مدیر

APRIL

جاسکتی ہیں۔

مزید درخواست

Madina Mansion,
Hyderabad